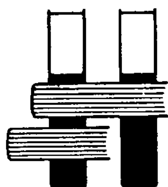
سندھ کی تاریخ کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

سندھ کی تاریخ کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی



فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ لاہور

نام کتاب	☜	سندھ کی تاریخ کیا ہے؟
مصنف	☜	ڈاکٹر مبارک علی
پبلشرز	☜	فکشن ہاؤس 18-مزنگ روڈ' لاہور فون:7249218-7237430
اہتمام	☜	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	☜	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	☜	حاجی حنیف پرنٹرز لاہور
سرورق	☜	عباس
اشاعت	☜	جنوری 2004ء
قیمت	☜	-/90روپے

انتساب

پروفیسر ساجدہ وندل کے نام

فہرست

پیش لفظ

تاریخ دو دھاری تلوار کی مانند ہے کہ جسے ایک طرف نفرت و تعصب اور دشمنی کے جذبات ابھارنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اسی کو معاشرے میں رواداری، روشن خیالی، امن و امان اور سلامتی کے لئے آگے لایا جاتا ہے۔ تاریخ اگر ایک طرف شخصیت پرستی کو ابھارتی ہے تو دوسری طرف یہی ہیروز اور عظیم لوگوں کو بلندی سے گرا کر انہیں زمیں بوس کر دیتی ہے۔ اگر اس کے ذریعہ متھس کو پیدا کیا جاتا ہے تو یہی ان متھس کے گرد بنے ہوئے مقدس ہالوں کو توڑتی ہے۔ اگر حکمراں طبقے اپنے سیاسی مفادات کے لئے اس کی سرپرستی کرتے ہیں، تو اس کے ذریعہ عوام کو تاریخ کی تشکیل اور بنانے میں ان کا جائز مقام دیا جاتا ہے۔

تاریخ نویسی میں وقت کے ساتھ تبدیلی آتی ہے، اب یہ محض واقعات کا مجموعہ نہیں رہی ہے بلکہ واقعات کی اب مختلف تھیوریز اور نظریات کی روشنی میں تشریح کی جاتی ہے، اسی وجہ سے تاریخ کے بہت سے پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ کہیں واقعات کو قوم پرستی کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے، تو کہیں اسے مارکسی نقطہء نظر سے پرکھا جاتا ہے، تو کہیں یہ فرقہ وارانہ تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں، تو کہیں انہیں جدید مفکروں کے افکار کے ذریعہ سمجھا جاتا ہے، جن میں مارکس، ویبر اور فو کو قابل ذکر ہیں۔

سندھ کی تاریخ میں تین نقطہائے نظر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک اسلامی، دوسرا سندھی قوم پرستی کا، اور تیسرا سیکولر۔ ان تینوں نظریات کی روشنی میں جب تاریخی واقعات کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو اس کی تشریح ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اس لئے قاری یہ سوال پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر کون سا نقطہء نظر درست اور صحیح ہے؟

سندھ کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے متبادل نقطہائے نظر کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کے ماخذوں اور مورخوں کے ذہن کا تجزیہ کیا جائے کہ تاریخ نویس کے پس پردہ کیا مقاصد تھے؟ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مضامین لکھے گئے ہیں کہ سندھ کی تاریخ کو اس پس منظر میں سمجھا جا سکے۔

میں ان دوستوں اور پڑھنے والوں کا مشکور ہوں کہ جو میری تحریروں سے متاثر ہوتے ہیں، جب بھی مجھے ان کی جانب سے یہ پیغامات ملتے ہیں کہ میری تحریروں کے ذریعہ ان میں تاریخ کا ذوق اور سمجھ پیدا ہو رہی ہے، تو میرے لئے یہ ہمت افزائی کی بات ہوتی ہے، کیونکہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں انحراف کرنے والوں کے لئے روز بروز جگہ تنگ ہوتی جا رہی ہے، وہاں اگر ذرا بھی آواز اٹھانے کے لوگ مل جائیں اور اس آواز کو سننے والے ہوں تو یہ ان کے لئے باعث نعمت ہے۔

میں اس بار پھر اپنے ناشر ظہور احمد خاں کا مشکور ہوں کہ جو میری تحریروں کو مقبول بنانے میں ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ کتاب کی اشاعت میں عباس اور شفیق تبسم کا برابر کا حصہ ہے۔ عباس ٹائٹل بنا کر اس کتاب کی خوبصورت کو بڑھاتے ہیں، تو شفیق کمپوزنگ کے ذریعہ اسے اشاعت کے قابل بناتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اعجاز بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ جو کتاب کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

مبارک علی

جنوری 2004ء

لاہور

سندھ کی تاریخ نویسی

قومی تاریخ اور علاقائی یا صوبائی تاریخ نویسی دو علیحدہ علیحدہ بنیادوں پر تشکیل ہوتی ہے۔ قومی تاریخ بحیثیت مجموعی قوم کی سیاسی' معاشی' سماجی اور ثقافتی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ اس تحقیق کے نتیجہ میں قومی ہیروز تاریخ میں نمایاں طور پر ابھرتے ہیں۔ قومی تحریکوں کے مقاصد کو علاقائی مفادات سے علیحدہ رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ اس میں قوم' ایک اہم عنصر کے طور پر ابھرتی ہے' جب کہ علاقہ اور قومیتیں تاریخ کے حاشیہ پر ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس علاقائی یا صوبائی تاریخ' قوم سے علیحدہ ہو کر اپنی تاریخ کو قومیت کی بنیادوں پر تشکیل دیتی ہے اور علاقائی سیاست' معیشت' اور ثقافت و سماجی سرگرمیوں کو اجاگر کرتی ہے۔ اس تاریخ نویسی میں' صوبائی یا علاقائی شخصیتیں علیحدہ سے ابھرتی ہیں' اور ان کے کارنامے صوبہ یا علاقہ کے لوگوں کے لئے باعث فخر ہوتے ہیں۔ لہٰذا قومی و علاقائی تاریخ نویسی متضاد رویوں اور رجحانات کو پیدا کرتی ہیں۔ ایک قومی شناخت کو ابھارتی ہے' تو دوسری علاقائی تشخص کو مضبوط کرتی ہے۔

ان دونوں تاریخوں میں اس وقت اور بھی تضادات بڑھ جاتے ہیں کہ جب قومی تاریخ نئی ہو اور علاقائی تاریخ قدیم و پرانی۔ یہ فرق اور دوری اس وقت اور زیادہ مسائل پیدا کرتی ہے کہ جب قومی تاریخ کو سیاسی تسلط کے لئے استعمال کیا جائے اور اس کے ذریعہ علاقائی شناخت اور تشخص کو پس منظر میں دھکیل دیا جائے' یا اسے کمزور کیا جائے' یا ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔

قومی اور علاقائی تاریخیں اس وقت بھی برسرپیکار ہو جاتی ہیں جب کسی ملک کے

علاقے اپنی علیحدہ جغرافیائی' لسانی اور ثقافتی شناخت رکھتے ہوں' اور انہیں ریاست کے جبر اور تشدد کے ذریعہ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ تعلیم دی جائے کہ قوم کے مفادات کے تحت علاقائی شناخت کو ختم کر کے' اس میں خود کو ضم کر دیا جائے۔

اس پس منظر میں اگر ہم پاکستان میں قومی اور علاقائی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے قیام کے وقت اس کے پانچ صوبے اپنی علیحدہ علاقائی تشخص کی بنیاد پر جداگانہ حیثیت رکھتے تھے' پاکستان کا بحیثیت ملک اور قوم کے وجود بالکل نیا تھا۔ اس لئے جب اس بات پر زور دیا گیا کہ پاکستانی قومیت علاقائی یا صوبائی قومیت سے زیادہ اہم اور برتر ہے' اور اس کے لئے ضروری ہے کہ علاقائی تشخص کو ختم کر کے اسے قوم میں ملا دیا جائے' تو اس کا رد عمل صوبوں میں تلخی کے ساتھ ہوا۔ جب صوبائی شناخت کو' صوبائی تعصب' اور صوبہ پرستی کے طور پر منفی انداز میں استعمال کیا گیا تو علاقہ کے لوگوں میں اس کی وجہ سے احساس محرومی اور غم و غصہ کے جذبات پیدا ہوئے۔

سندھ کی تاریخ نویسی پاکستان کے سیاسی حالات' ان کے اتار چڑھاؤ' اور تبدیلیوں کی عکاس ہے۔ جیسے جیسے ملکی و قومی حالات بدلتے گئے' اس طرح سے سندھ کی تاریخ نویسی کے رجحانات اور نظریات بھی بدلتے چلے گئے۔ اس مرحلہ پر یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ تقسیم کے وقت سندھ' دوسرے صوبوں کی طرح دو حصوں میں تقسیم نہیں ہوا' جیسے بنگال اور پنجاب۔ اور نہ ہی سرحد کی طرح کہ جہاں پشتون قبائل' سرحد اور افغانستان دونوں جگہوں پر موجود ہیں' مگر سیاسی سرحدوں کی وجہ سے تقسیم ہیں۔ بلوچ' بلوچستان میں بھی ہیں اور ایران میں بھی۔ اس کے برعکس سندھ جغرافیائی اور لسانی حیثیت سے ایک رہا۔ تاریخی طور پر بھی سندھ دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں اپنی علیحدہ تاریخ رکھتا ہے۔

تقسیم سے پہلے یہاں سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تھا' جو اپنا ایک

جرنل بھی شائع کرتے تھے۔ سوسائٹی اور جرنل کا سب سے اہم کارنامہ سندھ کی تاریخ کی تشکیل ہے۔ خصوصیت سے سندھ کی قدیم تاریخ پر تحقیق کی گئی تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ سندھ عربوں کے بعد تاریخی دور میں داخل نہیں ہوا' بلکہ اس سے پہلے بھی زمانہ قدیم میں اس کی تاریخی اہمیت تھی۔ (1) چونکہ اس وقت ہسٹاریکل سوسائٹی میں ہندو اور انگریز عہدیدار زیادہ سرگرم تھے' اس لئے سندھ کی تاریخ نویسی میں سیکولر رجحانات ابھرے' اور اس بات کی کوشش ہوئی کہ سندھ کے قدیم ماضی کے حوالہ سے علاقائی قومیت کو مضبوط کیا جائے جو کہ مذہب سے بالاتر ہو۔

پاکستان کے قیام سے اب تک ہم سندھ کی تاریخ نویسی میں جو رجحانات پاتے ہیں' اس کے پس منظر میں قومی سیاست اور اس میں سندھ کا کردار ہے۔ اس تاریخ نویسی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صوبہ سندھ کو دوسرے صوبوں اور علاقوں کے مقابلہ میں زیادہ ممتاز بتایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے قیام نے سندھ کو بحیثیت علاقہ کے کمزور کر دیا تھا۔ کراچی شہر کو اس سے علیحدہ کر کے نئی مملکت کا دارالحکومت بنا دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آنے والوں نے' اور ہندو سندھیوں کی ہجرت نے سندھیوں کی قومیت کو کمزور کر دیا تھا۔ ان حالات میں انہیں خطرہ تھا کہ ان کی جداگانہ حیثیت ان حالات میں ختم نہ ہو جائے' لہٰذا اس کا ردعمل یہ تھا کہ سندھ کی تاریخی اور لسانی حیثیت کو مضبوط کیا جائے تاکہ اس کی پہچان اور شناخت قائم رہے۔ اس مقصد کے تحت 1951ء میں سندھ کی صوبائی حکومت سندھی ادبی بورڈ کو قائم کیا تاکہ سندھی ادب' زبان' اور تاریخ پر تحقیقی کام ہو۔ بورڈ کی جانب سے یہ فیصلہ ہوا کہ نو جلدوں میں سندھ کی ایک جامع تاریخ لکھی جائے' جو ابتدائی زمانہ سے لے کر قیام پاکستان پر محیط ہو۔ تاریخ کے اس منصوبہ میں یہ بھی شامل تھا کہ فارسی کے بنیادی ماخذوں کی اشاعت کی جائے اور ان کے اردو و سندھی ترجمے بھی چھاپے جائیں۔

سندھ کی جامع تاریخ تو مکمل نہیں ہو سکی۔ مگر سندھ کی تاریخ کے بنیادی فارسی

ماخذوں کی اشاعت نے تاریخ کی تشکیل کے لئے مواد فراہم کیا۔ ان کے سندھی اور اردو ترجموں نے سندھ کے رہنے والوں میں سندھ کی تاریخ کا شعور پیدا کیا۔ یہ ایک کوشش تھی کہ سندھ کی تاریخ نویسی کی مدد سے سندھی اور اردو بولنے والوں کو سندھ کے تاریخی عمل میں مساوی حیثیت سے شریک کیا جائے۔

سندھ کی تاریخ نویسی میں ایک اہم رجحان اس کا اسلامی کردار ہے۔ اس بات پر فخر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ سندھ برصغیر کا وہ پہلا علاقہ ہے کہ جہاں عرب بطور فاتح کے آئے' اسے فتح کیا' اور یہاں پر اسلام پھیلایا۔ اس مناسبت سے سندھ کو "باب الاسلام" کا درجہ دیا گیا۔ موجودہ دور میں دائیں اور بازو کے نظریات کی جنگ میں "باب الاسلام" دائیں بازو والوں کے لئے ایک اہم علامت بن گیا ہے' اب ہر سال سندھ میں "یوم باب الاسلام" منا کر محمد بن قاسم کو بطور ہیرو پیش کیا جاتا ہے۔

سید سلیمان ندوی' عربوں کی فتح سندھ' اور ترکوں کی شمالی ہندوستان کی فتوحات میں فرق بتاتے ہوئے اس کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ عرب چونکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف تھے' اس لئے صحیح معنوں میں برصغیر میں اسلام لانے والے وہ تھے' ترک فاتحین نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> چونکہ ہندوستان میں جو ترک' افغان' اور مغل فاتح آئے وہ مسلمان تھے' اس لئے ان کی تمام کاروائیوں کا ذمہ دار اسلام سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس حقیقت سے ہم سب کو واقف ہونا چاہئے تھا کہ ترک فاتح جو ہندوستان آئے خاص خاص افسروں یا عہدے داروں کو چھوڑ کر قوم کی مجموعی حیثیت سے وہ اسلام کے نمائندے تھے نہ ان کے اصول سلطنت کو اسلام کی طرز حکومت اور اصول فرماں روائی سے کوئی مناسبت تھی..... برخلاف اس کے عرب فاتح..... وہ لوگ تھے جن میں اسلام کی تعلیمات زندہ تھیں..... اس لئے ان کے طور طریق' اصول حکومت اور طرز

سلطنت خیبر سے آنے والی قوموں سے بالکل مختلف تھے۔ (2)

اس نقطہ نظر کے تحت سندھ کی اسلامی حیثیت ہے جب کہ برصغیر میں جہاں جہاں مسلمان ہیں' وہ علاقے سندھ کے مقابلہ میں اپنے اسلامی کردار میں کمزور ہیں۔ سندھ کی باب الاسلام ہونے کی حیثیت اس وقت اور بڑھ گئی کہ جب قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ پاکستان تو اس وقت بن گیا تھا کہ جب پہلا مسلمان سندھ کے ساحل پر وارد ہوا تھا۔

لہذا باب الاسلام ہونے' عربوں کی فتح اور صحیح اسلامی تعلیمات نے سندھ کے صوبہ کو نہ صرف برصغیر بلکہ پاکستان دوسرے صوبوں سے ممتاز کر دیا۔ کیونکہ دوسرے صوبوں میں اسلام بعد میں آیا' پھر یہ اسلام ترک' افغان' اور مغل فاتحین کے ذریعہ آیا کہ جو عربوں کے مقابلہ میں اسلام کی تعلیمات سے واقف نہیں تھے۔ اس لئے سندھ کا اسلامی کردار زیادہ حقیقی اور گہرا ہے' جب کہ برصغیر کے دوسرے مسلمان ترکوں اور مغلوں کی سماجی و ثقافتی روایات اور رسومات کے وارث ہیں۔

سندھ کی تاریخ نویسی میں ایک اور اہم موضوع سندھ کا تحریک آزادی اور قیام پاکستان میں حصہ ہے۔ اس کا آغاز جو تحریک سے ہوتا ہے' اور تحریک خلافت' ہجرت تحریک' اور ریشمی رومال کی تحریک ہے کہ جن میں سندھ کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان تحریکوں میں شمولیت نے سندھ کو شمالی ہندوستان' اور بنگال کے مسلمانوں کی جدوجہد میں برابر کا شریک کر دیا۔ 1937ء میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی نے برصغیر کے مسلمانوں میں ایک نیا سیاسی شعور پیدا کیا' اور اس نے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو مضبوط بنانے میں مدد دی۔

سندھ کی تاریخ نویسی میں اس بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں سندھ کا حصہ انتہائی اہم رہا ہے۔ مثلاً 1938ء میں کراچی میں صوبائی مسلم لیگ نے ایک آزاد مسلمان ریاست کے قیام کے لئے ریزولوشن پاس کیا' اسے شیخ عبدالمجید سندھی نے پیش کیا تھا۔ 3 مارچ 1943ء سندھ اسمبلی میں پاکستان کے قیام کے

سلسلہ میں جو تجویز پیش کی گئی' اس کی حمایت میں جی۔ ایم۔ سید نے پرزور تقریر کی تھی' اور کہا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان ایک جدا قوم ہیں۔ ان کا مذہب' فلسفہ' سماجی رسومات' ادب' روایات' سیاسی اور اقتصادی نظریات بالکل مختلف ہیں' لہٰذا انہیں ایک قوم تسلیم کرتے ہوئے علیحدہ علاقہ دیا جائے۔ (3) 1946ء میں سندھ کی صوبائی اسمبلی نے سب سے پہلے پاکستان میں شامل ہونے کی قرار داد پیش کی۔ سندھی ادبی بورڈ کی جانب سے' اس کے رسالہ "مہران" نے 1985ء میں تحریک آزادی نمبر شائع کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹوریل میں سندھ اور تحریک آزادی کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ

"وطن عزیز پاکستان کا اصل خالق سندھ ہے۔" (4) آگے چل کر اس پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد دوسرے صوبے سندھ کے اس تاریخی کردار کو یا تو گھٹا کر پیش کر رہے ہیں' یا اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مثلاً قائداعظم محمد علی جناح کہ جن کی جائے پیدائش جھرک ہے' اس کے بجائے اب کراچی کے وزیر میشن کو یہ مقام دیا گیا ہے۔ سندھ کے مشاہیر اور تاریخ ساز شخصیتوں کے بارے میں قومی سطح پر ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔ (5) لہٰذا مہران کے اس شمارے میں دو حصے ہیں : حصہ اول میں سندھ کا آزادی کی تحریکوں سے متعلق کردار ہے' دوسرے حصہ میں تحریک آزادی کی 18 اہم سندھی شخصیتیں ہیں۔

تحریک آزادی اور پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں سندھ اپنے کردار کو پیش کر کے' صوبائی حقوق اور صوبائی خود مختاری کے حق کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ قیام پاکستان کے بعد سندھ کو حکومت میں وہ نمائندگی نہیں ملی تھی' جس کا وہ خواہش مند تھا۔ اس بنیاد پر آج بھی سندھ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔

سندھ کی تاریخ نویسی میں اس وقت انقلابی تبدیلی آئی جب 1956ء کے دستور میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ملا کر ون یونٹ بنا دیا گیا۔ اس عمل نے سندھ کو ایک بار پھر اسی صورت حال سے دوچار کر دیا کہ جو بمبئی سے الحاق کی صورت میں

تھی۔ سندھ کی خودمختاری ایک بار پھر ختم ہو گئی' اور وہ بمبئی کی جگہ لاہور کا ماتحت ہو کر رہ گیا۔

اس عمل میں سندھ کے راہنماؤں کی موقع پرستی بھی ابھر کر آئی۔ ان میں وہ راہنما بھی تھے کہ جنہوں نے اپنے ذاتی مفادات اور فوائد کی خاطر ون یونٹ کی حمایت کی' اور اس کی تشکیل میں اپنے ذرائع اور توانائیاں استعمال کیں۔ اس مرحلہ پر وہ راہنما بھی سامنے آئے کہ جنہوں نے اس سیاسی عمل کی مخالفت کرتے ہوئے قید و بند اور سزاؤں کو برداشت کیا۔

ون یونٹ کے تجربہ نے اہل سندھ کو سیاسی طور پر باشعور بنانے میں بڑی مدد دی' کیونکہ ان پر پنجاب کی بالا دستی تھی۔ سندھ بیراج کی زمینیں فوجی افسروں اور بیورو کریٹس کو دے دی گئیں۔ سرکاری ملازمتوں میں غیر سندھیوں کا تسلط ہو گیا' ان حالات میں اہل سندھ کو احساس ہوا کہ "باب الاسلام" ہونے اور تحریک آزادی اور پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں ان کی حمایت نے انہیں نہ صرف حقوق سے محروم کر دیا' بلکہ سیاسی و معاشی اور ثقافتی طور پر ان کو پس ماندہ بنا دیا۔ لہٰذا سندھ کی تاریخ نویسی میں اب تک جو اہمیت مذہب اور مذہبی شناخت تھی' اسے رد کر دیا گیا۔ اس کے مقابلہ میں جو نئے رجحانات پیدا ہوئے' اس نے سندھ میں "سندھی نیشنل ازم" کے جذبات کو پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی تاریخ نویسی میں ان واقعات کو اجاگر کیا گیا کہ جن میں غیر ملکیوں کے حملوں کی وجہ سے سندھ کو نقصان اٹھانا پڑا تھا اور غیر ملکی ثقافت کا سندھ پر تسلط ہو گیا تھا' اس موقع پر سندھ کی تاریخ میں دو گروہ پیدا ہوئے تھے: ایک وہ تھے کہ جنہوں نے سندھ کے دفاع میں قربانیاں دیں تھیں غیر ملکیوں کے خلاف مزاحمت کی تھی' اور دوسرے وہ تھے کہ جنہوں نے سندھ کے مفاد کو ایک طرف کر کے اپنے فوائد کے لئے مفاہمت کی تھی۔ اس نے "سندھ کے سورما اور سندھ کے غداروں" کے تاریخی کردار کا جائزہ لیا گیا۔ (6)

دوسری اہم بات جو اس تاریخ نویسی کی ہے وہ یہ کہ غیر ملکیوں نے سندھ پر جو

مظالم کئے اس نے سندھ کے لوگوں کی معاشی حالت کو تباہ و برباد کر دیا' جس کی وجہ سے ان کی ثقافت و کلچر کمزور ہوا- یہ ایک "مظلوم سندھ" کا تصور تھا کہ جو غیر ملکیوں کے اقتدار میں تکلیف و اذیت اور محرومی کا شکار رہا-

چنانچہ سندھی نیشنل ازم کے تحت جو نئی تاریخ لکھی گئی' اس میں تاریخ کو سیکولر طور پر پیش کیا گیا- سندھ کی تاریخ کی جڑیں وادی سندھ کی تہذیب میں تلاش کی گئیں- اس تہذیب کی ترقی اور عروج کو اہل سندھ منسوب کرتے ہوئے دعویٰ کیا گیا کہ سندھ کی تہذیب دنیا کی قدیم تہذیبوں کے مقابلہ پر ہے- یہ تہذیب سندھ کا ورثہ ہے کہ جس نے سندھ کو تہذیبی لحاظ سے ایک اعلیٰ مقام دیا ہے-

جی- ایم- سید نے سندھ کی تاریخ نویسی میں جو اہم تبدیلیاں کیں' وہ یہ کہ انہوں نے عربوں کی فتح سندھ کو باعث رحمت نہیں بلکہ باعث رسوائی قرار دیا- محمد بن قاسم جو اب تک فاتح اور ہیرو تھا' وہ حملہ آور اور غاصب ہوا کہ جس نے سندھ پر حملہ کر کے اسے مفتوح بنا کر اس کو پس ماندہ بنایا- اس کی جگہ اصل ہیرو راجہ داہر تھا کہ جس نے مادر وطن کا دفاع کیا- یہاں سندھ کی تاریخ اسلام پسندوں اور قوم پرستوں میں تقسیم ہو جاتی ہے- اسلام پرست سندھ کی قدیم تاریخ' وادی سندھ کی تہذیب اور اس پر فخر کرنے کو غیر اسلامی سمجھتے ہوئے' اسے رد کرتے ہیں- اور سندھ کی تاریخ کی ابتداء عربوں کی فتح سے کرتے ہیں' جب کہ قوم پرست مورخ عربوں کی فتح کو دوسرے حملہ آوروں کی طرح ایک غاصبانہ حملہ تصور کرتے ہوئے اس کی مذمت کرتے ہیں- ان دونوں رجحانات میں سندھ کی موجودہ سیاست جھلکتی ہے- حملہ آور چاہے مسلمان ہو' یا غیر مسلم- اسے بطور حملہ آور اور غاصب کے دیکھنا چاہئے' وطن کا دفاع چاہے کوئی کرے' ہندو یا مسلمان' اس کی عزت کرنی چاہئے- (7)

جی- ایم- سید نے سندھ کی تاریخی ماخذوں پر تنقید کی کہ جن میں ان حملہ آوروں کی تعریف و توصیف ہے جیسے چچ نامہ یا جنت سندھ وغیرہ- ان کے نزدیک ان تاریخوں میں سندھ کے لوگوں کے لئے مدہوشی کا مواد ہے کہ جو انہیں صحیح تاریخی شعور

سے محروم کر دیتا ہے۔ (8) لہٰذا وہ تمام فاتح جنہوں نے سندھ کو فتح کیا وہ غاصب' ظالم' اور سندھ کو تباہ کرنے والے تھے' چاہے وہ دارا ہو' یا محمد بن قاسم' محمود غزنوی' علاء الدین' شاہ بیگ ارغوانی' خان خاناں' فرخ سیر ہو یا چارلس نپیر۔ (9)

موجودہ سیاسی حالات میں ضروری تھا کہ سندھ کی تاریخ کو ہیروز اور غداروں کے آہنگ میں لکھا جائے۔ یعنی وہ افراد کے جنہوں نے سندھ کا دفاع کیا' اس کے لئے قربانیاں دیں' اور اپنے ذاتی مفادات کو ملک و قوم کے مفادات پر ترجیح دی۔ وہ لوگ کہ جنہوں نے غیر ملکیوں' فاتحین' اور غاصبوں سے مفاہمت کرتے ہوئے ذاتی فوائد حاصل کئے۔ لہٰذا سندھ کے سورماؤں میں راجہ سھیرس' راجہ داہر' دو دو سومرو' دریا خان' مخدوم بلاول' شاہ عنایت' ہوش محمد شہید' الہ بخش سومرو' اور ہیمو کلائین شامل ہیں' جب کہ غداروں میں قاضی قاطن' ناؤ مل اور میر علی مراد اہم ہیں کہ جنہوں نے سندھ سے غداری کی۔ اس نئی تاریخ نویسی میں یہ پیغام دیا گیا کہ سندھ کی آزادی کی جنگیں جو کیچ' مکران' ٹھٹھہ' میانی اور دبہ میں لڑی گئیں تھیں وہ ختم نہیں ہوئی ہیں' بلکہ اب تک جاری ہیں اور اب یہ جنگیں شہر شہر اور گاؤں گاؤں لڑی جائیں گی۔ (10)

سندھ پر غیر ملکی تسلط کے کیا اثرات ہوئے؟ اس موضوع پر 1962ء میں سندھی ادبی بورڈ نے مغل عہد کی ایک کتاب "تاریخ مظہر شاہ جہانی" شائع کی جس کا مقدمہ حسام الدین راشدی نے لکھا ہے۔ اس مقدمہ میں انہوں نے خصوصیت سے ان واقعات کا انتخاب کیا ہے کہ جن میں سیوستان کے مغل گورنر کے سندھ کے لوگوں پر مظالم کی تفصیل ہے۔ اس کو اگر زمانہ حال کے تناظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ آج بھی غیر ملکی تسلط میں اس طرح سے مظالم کا شکار ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ سندھ کے گورنر کا نائب میرزا یوسف: "ہر روز بے گناہ لوگوں کو شہر سے بلوا کر اپنے سامنے کوڑے لگواتا تھا..... اس طرح دو تین سو بے گناہوں کا پیٹنا اس کے ہاں روزانہ کا معمول تھا..... زد و کوب کرتے وقت جتنے مظلوم مرجاتے تھے اس کی باز پرس کرنے والا کوئی نہیں تھا..... ظلم کی گھٹا اتنی گھنگھور چھائی ہوئی تھی کہ داد گیری کے

لئے کہاں پکارتے اور کس کی زنجیر جا کر ہلاتے؟" (11) مغل حکومت اور اس کے عہدیداروں کے مظالم میں لوگوں کی دولت و جائداد ضبط کرنا' بے تحاشا ٹیکس لگانا' اذیت کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنا' لوگوں سے رشوت لینا' ڈاکوؤں اور رہزنوں کی سرپرستی کرنا اور شہر کے معزز لوگوں کی بے عزتی کرنا شامل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ :

> سیوستان کا پورا علاقہ تباہ و برباد ہو گیا۔ قصبے ویران' آبادیاں اجاڑ اور زمینیں بنجر بن گئیں۔ لوگ حیران اور درماندہ ہو کر سندھ کے دوسرے علاقوں اور قصبوں میں جا کر پناہ گزیں ہو گئے..... یہ سب کچھ ہوتا رہا' لیکن کسی کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ (12)

اسی وقت محمد عثمان ڈیپلائی نے ایک تاریخی ناول "سانگھڑ" کے نام سے 1962ء میں شائع کیا۔ جس میں حر تحریک اور برطانوی حکومت کے درمیان مزاحمت کو بیان کیا گیا ہے تاکہ نئی نسل کو یہ تاریخی شعور ہو کر سندھ کے عوام غیر ملکیوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں۔

سندھ کے لوگوں میں تاریخی شعور پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ تاریخ کو اس طرح سے بیان کیا جائے کہ جس سے سندھ کی عظمت و بڑائی' اور تہذیبی ورثہ کی زرخیزی ثابت ہو۔ اس تہذیبی عمل کی تاریخ موہنجو داڑو سے شروع ہوتی ہے اور پھر اس ثقافتی ورثہ کی جھلکیاں جام نظام الدین کے مقبرے کے نقش و نگار' رنی کوٹ و عمرکوٹ کے قلعوں' حیدر آباد شہر کے ہوا دانوں' سندھ کی اجرک' رلی' کاشی کاری کے ٹائلوں' اور فرنیچر میں نظر آتی ہے۔ (13)

سندھی ادب کے درخشاں ستارے شاہ لطیف' سچل اور سامی ہیں کہ جنھوں نے اپنی شاعری میں سندھ کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ اور سندھی زبان کو زرخیز بنا کر اسے ایک جداگانہ حیثیت دی ہے۔ سندھی قوم پرستی کی بنیاد مذہب پر نہیں ہے' بلکہ زبان اور علاقہ پر ہے۔ سندھی بولنے والا چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم وہ قوم کا رکن

ہے۔ اس نظریہ نے دو قومی نظریہ کی نفی کرتے ہوئے' سندھی قومیت کو سیکولر بنیادوں پر استوار کیا ہے۔

یہاں اس بات کی جانب اشار کرنا ضروری ہے کہ جب بھی تاریخ کو نیشنل ازم کے تحت لکھا جاتا ہے تو واقعات کو نہ صرف مسخ کیا جاتا ہے بلکہ اس کے بیان میں مبالغہ سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ نیشنل ازم کے مخالف اگر واقعات ہوں تو انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سندھ کی تاریخ نویسی میں بھی ہم ان رجحانات کو دیکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سندھ کی تاریخ نویسی کے یہ نظریات علمی طور پر پیش نہیں کئے گئے' بلکہ انہیں جذباتی طور پر لکھا اور پھیلایا گیا ہے۔ سندھ کی مظلومی اور محرومی سے فائدہ اٹھانے والے سندھ کے وڈیرے اور زمیندار رہے' جب کہ سندھ کے عوام اسی طرح سے استحصال کا شکار ہوتے رہے۔

سندھ کی تاریخ نویسی' سندھی نیشنل ازم کے اتار چڑھاؤ میں آکر ٹھٹھر کر رہ گئی۔ اس میں صرف اس حد تک نئے خیالات اور نظریات آئے کہ جہاں تک اس نے نیشنل ازم کو سہارا دیا' اور قومی تحریک کے مفادات کو پورا کیا لیکن سندھ کی تاریخ نویسی میں علمی طور پر کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ اس بات کی کوئی کوشش نہیں ہوئی کہ سیاست نے آگے بڑھ کر اسے دوسرے سماجی علوم کی روشنی میں تشکیل دیا جائے اور سندھ اور اس کے معاشرے و سماج پر تحقیق کی جائے۔ مثلاً یہ کہ ٹیکنالوجی نے سندھ کے معاشرے پر کیا اثرات ڈالے؟ کن کن مراحل پر سماجی تبدیلیاں ہوئیں اور انہوں نے سندھ کے سماجی طبقات کی کس انداز سے تشکیل کی۔ کیا سندھ میں کسانوں کی بغاوتیں ہوئیں؟ اس کا زراعتی اور کاشتکاری کا نظام کیا تھا؟ اس کا قبائلی نظام کن بنیادوں پر قائم تھا؟ غیر ملکی تجارت نے سندھ پہ کیا اثرات ڈالے؟ حال ہی میں شکار پور اور حیدر آباد کے ہندو تاجروں اور ان کی تجارتی سرگرمیوں پر کلاڈ مارکووٹس نے کام کیا ہے۔

The global world of Indian Merchants. (1750-1947)

اس سے سندھ کے ہندو تاجر اور ان کی پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تجارت کے بارے میں بیش بہاء معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس طرح سندھ کے عالموں' پر سندھ میں

سکھوں کی موجودگی اور ان کے مذہبی رویئے۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے موضوعات ہیں کہ جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

دیکھا جائے تو سندھ کی تاریخ ابھی نامکمل ہے۔ اس کو سیاست اور تنگ نظریات سے آزاد کر کے' وسیع بنیادوں پر مکمل کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر موجودہ حالات میں یہ ایک خواب معلوم ہوتا ہے' کیونکہ سندھ کی یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے' ان تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہیں جو سندھ کی تاریخ پر تحقیقی و علمی کام کر سکیں۔ تاریخ کا کام محض سیاسی مفادات ہی کو پورا کرنا نہیں ہے' بلکہ اس کا کام لوگوں میں ایک ایسا تاریخی شعور پیدا کرنا ہے کہ جو ماضی و حال کو سمجھنے میں مدد دے۔

حوالہ جات

1- ڈاکٹر مبارک علی: سندھ: خاموشی کی آواز- لاہور' 1994ء' ص 256

2- سلیمان ندوی: عرب و ہند کے تعلقات کراچی' 1976ء- ص 187-192

3- مہران: تحریک آزادی نمبر- نمبر1' اور 2' سال 1985ء' سندھی ادبی بورڈ' جام شورو- ص 17' 18-

4- ایضاً: ص 5

5- ایضاً: ص 6

6- ڈاکٹر مبارک علی' ص 45

7- عبدالواحد آریسر: جی- ایم- سید- منظور آباد (۵) ص 56

8- ایضاً: ص 55

9- ایضاً: ص 58

10- ایضاً: ص 63

11- حسام الدین راشدی: مقدمہ' تاریخ مظہر شاہجہانی (یوسف میرک) سندھی ادبی بورڈ' حیدر آباد 1962ء ص 21

12- ایضاً: ص 30' 31

13- آریسر: ص 62' 63

سندھ کی تاریخ نویسی: ایک تجزیہ

قوموں کو فاتحین کے ہاتھوں صرف میدان جنگ ہی میں شکست نہیں ہوتی ہے' بلکہ ان کی شکست فوجی سے زیادہ سماجی' ذہنی' تہذیبی اور معاشی طور پر ہوتی ہے جو ان کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اس ذہنی تبدیلی میں سب سے زیادہ اثر کرنے والا عنصر تاریخ نویسی کا ہوتا ہے جو اس انداز سے لکھی جاتی ہے کہ یہ مفتوح کو اس کی اپنی نظروں میں کم تر بنا دیتی ہے۔ فاتحین اپنی تاریخ نویسی میں مفتوح کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے کردار کو اپنے بنائے ہوئے فریم ورک میں ڈھال لیتے ہیں۔ اپنے حملے کے جواز میں جو دلائل دیئے جاتے ہیں' ان میں فاتح انصاف پسند و عادل اور مفتوح ظالم و جابر ہوتا ہے' جب تاریخ کو اس طرح سے تشکیل دیا جاتا ہے تو فاتح مفتوحین کے لیے باعث رحمت بن جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ نہ صرف اپنے ماضی کو فراموش کر دیتے ہیں۔ بلکہ اس پر شرمندہ بھی ہوتے ہیں۔

شکست کھانے کے بعد مفتوح کی جانب سے اپنے دفاع کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی ہے۔ اس لیے فاتحین جس تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں وہی تاریخ صحیح اور درست بن جاتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک عرصہ بعد اگر مفتوحین اپنے ملک کو آزاد کرا لیتے ہیں' تو وہ آزادی کے بعد اپنی تاریخ کی نئے سرے سے تشکیل کرتے ہیں اور ان کا وہ ماضی جو کھو چکا تھا اس کی از سر نو دریافت کرتے ہیں' اس کے صحیح خدوخال سامنے لاتے ہیں' اپنے روایات و اقدار کو ابھارتے ہیں اور اس طرح اپنی قومی شناخت کو مضبوط کرتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس دوسری صورت بھی ہوتی ہے کہ شکست کے بعد مفتوح قومیں فاتحین کی

تہذیب وثقافت میں اس قدر ڈھل جاتی ہیں کہ اپنی اصلیت کو کھو دیتی ہیں اور ایک نئی شناخت کو پیدا کر لیتی ہیں۔ اس صورت میں فاتحین کی تاریخ ان کی اپنی ہو جاتی ہے اور بیرونی حملہ آور ان کے ہیرو ہو جاتے ہیں۔ جب یہ صورت حال ہو تو انہیں اپنے قدیم ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ہے وہ اسے فراموش کر کے اپنے رشتے اس دور اور عہد سے ملا لیتے ہیں کہ جب فاتحین نے ان کے ملک پر حملہ کر کے قبضہ کیا تھا۔

اس صورت حال میں معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے: ایک وہ جماعت کہ جو فاتحین کی تہذیب وثقافت کو تسلیم نہیں کرتی اور اپنی قدیمی شناخت کو قائم رکھنے کی جدوجہد کرتی ہے' دوسری وہ جو قدیم ماضی سے رشتہ توڑ کر فاتحین کی تہذیب میں خود کو ضم کر دیتی ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فاتحین کی تاریخ نویسی کے بارے میں وضاحت کر دی جائے کہ اس کی تشکیل میں کون کون سے اہم عناصر ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر فاتح کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے حملہ کو جائز قرار دے۔ اس لیے اس کا حملہ کسی نہ کسی ''مجبوری'' یا ''ضرورت'' کے تحت ہوتا ہے تاکہ اس صورت میں حملہ کا اخلاقی جواز فراہم ہو جائے۔ جب بھی حملہ کے دلائل دیئے جاتے ہیں۔ تو حملہ آور اپنے معاشی وسیاسی مقاصد کو چھپاتا ہے اور حملہ کی وجہ مفتوح قوم کی نااہلی' بدعنوانی' یا غداری کو دیتا ہے۔

حملے کے دلائل میں عام طور سے جو دلیل دی جاتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ مفتوح ملک کے سربراہ' حکمران یا حکومت اپنی رعایا کے لیے ظالم و جابر ہوتی ہے جس کی وجہ سے ملک میں بدامنی اور لاقانونیت کا راج ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں رعایا حملہ آوروں کا ساتھ دیتی ہے' اور اپنے حکمرانوں سے نجات حاصل کر لیتی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ فاتحین کی تاریخ میں عوام ان کا خیر مقدم کرتے ہیں' فتح میں ان کی مدد کرتے ہیں' ان کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرتے ہیں' ان کی فوجوں کے ساتھ لڑتے ہیں اور اپنے ملک کو غاصبوں سے آزاد کراتے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ فاتحین کا ملک فتح کرنا' وہاں کے لوگوں کی نجات کے لیے ضروری تھا۔ اس ضمن میں اکثر مفتوح قوم اور ان کے معاشرے کو زوال پذیر بتایا جاتا ہے۔ کہ جس کی وجہ سے سیاسی استحکام نہیں رہا تھا۔ اور ملک وقوم کی حالت دگرگوں تھی۔ سیاسی طاقت کے کمزور ہونے کی وجہ سے ملک میں خلاء تھا' جسے حملہ آوروں نے پر کیا۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد انہوں نے نہ

صرف ملک میں سیاسی استحکام پیدا کیا' بلکہ ملک کے معاشی حالات کو سدھارا' بدعنوانیاں ختم کیں۔ لاقانونیت کا خاتمہ کیا اور لوگوں کو سکون واطمینان اور امن دیا۔

اس تاریخ نویسی کی ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں جہاں اپنی بہادری اور شجاعت کا ذکر ہوتا ہے وہاں مفتوحین کو بزدل قرار نہیں دیا جاتا ہے بلکہ ان کی بہادری اور دلیری کی تعریف کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ثابت کیا جائے انہوں نے ملک کو بغیر لڑے اور مزاحمت کے فتح نہیں کیا' بلکہ ان کی فتح سخت مزاحمت اور خون ریز جنگوں کے بعد ہوئی۔ کیونکہ اس صورت میں انہیں بطور فاتح ملک پر قبضہ کرنے کا جواز مل جاتا ہے۔ پرامن طریقہ سے قبضہ کی صورت میں ان کے قبضہ کا جواز کمزور ہو جاتا ہے۔

(2)

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم چچ نامہ کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے کہ یہ تاریخ عربوں کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس میں سندھ کے مفتوحین کو عربوں نے اپنی نظر سے دیکھ کر ان کے بارے میں رائے دی ہے۔ اس میں عرب حملہ آوروں کے حملے کے جواز میں جو دلائل دیئے گئے ہیں ان میں اولیت اس دلیل کو ہے کہ چچ کے خاندان میں حکومت غاصبانہ طور پر آئی۔ چچ نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سازش کے ذریعہ تخت وتاج پر قبضہ کر لیا۔ اس دلیل کے تحت ایک غاصب حکمراں گھرانہ ملک کا جائز وارث نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے اگر اس سے حکومت چھین لی جائے تو یہ اخلاقی طور پر درست اور صحیح ہے۔

راجہ داہر کی تصویر کشی اس طرح سے کی گئی ہے کہ اس کی شخصیت کو اخلاقی طور پر کمزور بتایا جائے۔ اس نے حکومت کی لالچ اور اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے اپنی بہن سے شادی کر لی۔ لہٰذا ایک ایسے شخص کا حکمراں ہونا ملک کے لیے باعث شرم تھا۔ اس دلیل کے تحت اگر ایک ایسے بداخلاق شخص کو تخت وتاج سے محروم کر دیا جائے تو اخلاقی اقدار کی سب سے بڑی فتح ہے۔

چچ نامہ میں محمد بن قاسم کے حملے کی وجہ عورتوں اور بچوں کی گرفتاری بتایا گیا ہے کہ جنہیں داہر کے آدمیوں نے سمندر میں پکڑ لیا تھا' لیکن ان وجوہات کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ جو سندھ پر قبضہ کے سلسلہ میں ابتدائے اسلام سے ہو رہی تھیں۔ ان مقاصد میں بحر ہند پر عربوں کا

تسلط کرنا سب سے اہم تھا' تا کہ ان کی تجارت بحری قزاقوں سے محفوظ ہو جائے۔

چچ نامہ میں عربوں اور سندھیوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کو حق و باطل کے درمیان مقابلہ کہا گیا ہے۔ ایک طرف حق' سچائی' عدل و انصاف تھا' تو دوسری طرف ظلم و جبر اور ناانصافی۔ راجہ داہر کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں' ان میں اسے ''داہر کافر' اور داہر لعین'' کہا گیا ہے۔ عربوں کی نظروں میں وہ کفر' گمراہی اور ظلمت کی علامت تھا۔ لہٰذا اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ عربوں کو تائید الٰہی حاصل تھی' جب کہ کافر اس سے محروم تھے اس لیے جب کافروں نے لشکر اسلام کو دغا اور فریب سے ختم کرنا چاہا تو اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ مثلاً جب سندھ کے ایک سردار کاکہ بن کوتل نے لشکر اسلام پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا تو وہ راستہ سے بھٹک گیا اور ساری رات ادھر ادھر آوارہ پھرتا رہا۔ جب اس نے عربوں سے صلح کر لی تو اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ''جب ہم نے (شبخون کی ناکامی) کا یہ معجزہ بھی دیکھا تو ہمیں یقین ہو گیا (یہ بھی) حکم الٰہی ہے۔ اور کوئی بھی (تم سے) فریب اور دغابازی سے مقابلہ نہ کر سکے گا۔'' (چچ نامہ (اردو ترجمہ) حیدر آباد 1963' ص 167)

چچ نامہ میں مفتوحین جگہ جگہ یہ اقرار کرتے ہیں کہ ان کے نجومیوں اور معتبر لوگوں نے یہ پیشین گوئی کر دی تھی کہ ان کا ملک عربوں کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ لہٰذا اس قسم کی پیشن گوئیوں کے بعد لوگوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ فاتحین کی اطاعت قبول کر لیں۔ مثلاً سردار کاکہ نے کہا کہ: ''ہمارے نجومیوں اور معتبر لوگوں نے علم نجوم سے نتائج اخذ کر کے یہ حکم صادر کیا ہے کہ یہ ملک اسلامی لشکر کے قبضہ میں آئے گا'' (چچ نامہ۔ 167)

چچ نامہ میں بار بار ان افراد اور گروہوں کا ذکر ہے کہ جو راجہ داہر کو چھوڑ کر محمد بن قاسم کی مدد کرتے ہیں۔ مثلاً دیبل شہر کے اس برہمن کا لشکر اسلام کی مدد کرنا کہ جس نے قلعہ کی فتح کا راز بتایا۔ ''امیر عادل سلامت رہے! ہمارے نجوم کی کتابوں میں اس طرح حکم ہے کہ ملک سندھ لشکر اسلام کے ہاتھوں فتح ہوگا اور کافر شکست کھائیں گے'' (چچ نامہ۔ 39)

اس میں برہمن محمد بن قاسم کو ''امیر عادل'' کہہ کر مخاطب ہے۔ عربی لشکر کو لشکر اسلام اور سندھیوں کے لشکر کو کافروں کا کہہ رہا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ الفاظ ایک موقع پرست اور خوشامدی کے ہیں یا مصنف نے اپنی طرف سے اس برہمن سے یہ کہلوایا ہے۔

چچ نامہ میں یہ بھی بار بار کہا گیا ہے کہ لشکر اسلام کو تائید الٰہی حاصل تھی۔ حجاج بن یوسف کے ایک خط کا حوالہ ہے کہ:

> دریا عبور کرو اور تائید الٰہی کی التجا کرتے رہو اور اس کی رحمت کو اپنی پناہ جانتے رہو ایک دوسرے کے مدمقابل ہونے کے وقت رضائے الٰہی پر اعتماد رکھتے ہوئے اپنی پوری شجاعت اور ہمت کا مظاہرہ کرنا کیونکہ فتح اور تائید (الٰہی) تمہارے ہمرکاب اور قدرت تمہارے ساتھ اور مددگار ہے اور فرشتوں کی امداد اور مسلمانوں کی تلوار تمہاری طرف سے ان (مخالفوں) پر مسلط ہے۔ خدائے عزوجل ان کی خبیث ذات کو مسلمانوں اور فرشتوں کی تلواروں اور نیزوں کی خوراک بنائے گا۔ غضب الٰہی (کا دروازہ) ان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے پورے انتقام اور عبرتناک انجام کے سزاوار ہوں گے۔ (چچ نامہ۔ 195)

لہٰذا عربوں کی فتح خدائی مرضی اور تائید سے ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ملک خدا نے انہیں بخش دیا۔ جو ملک خدا کی مدد سے ملا ہو اس پر قبضہ کرنے اور اس کا مال غنیمت حاصل کرنا اور اس پر حکومت کرنا اخلاقی و مذہبی طور پر جائز ہو جاتا ہے۔ راجہ داہر کی شکست اور اس کا قتل اس تائید الٰہی کا مظہر تھا۔ (چچ نامہ۔ 201)

راجہ داہر سے جنگ کرنے کے لیے جب محمد بن قاسم دریا پار کر کے دوسری طرف جاتا ہے تو اپنے لشکر کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:

> اے لشکر اسلام! اب مہران کا پانی تمہاری پشت پر ہے اور کافروں کا لشکر تم سے مقابلہ کے لیے آئے گا۔ جس کے دل میں واپس جانے کا خیال ہو وہ یہیں سے واپس چلا جائے کیونکہ (جسوقت) دشمن سامنے آئے گا اور جنگ شروع ہو گی اگر اس وقت کسی شخص نے منہ موڑا تو لشکر دل شکستہ ہو کر راہ فرار اختیار کرے گا۔ جس کی وجہ سے دشمن ہم پر غالب ہو جائے گا (اور یہ ہمارے لیے) بڑا ننگ ہوگا۔ بھاگنے والا حرام موت مرے گا۔ اور پھر آخرت کے عذاب میں گرفتار (ہوگا) (چچ نامہ۔ 219)

یہ تقریر اس واقعہ سے ملتی جلتی ہے کہ جس میں طارق بن زیاد نے کشتیاں جلا کر اپنی فوج کی ہمت افزائی کی تھی۔

چچ نامہ سندھ کی تاریخ کا اہم ماخذ ہے۔ موجودہ دور میں مورخوں نے اس کا جو تجزیہ کیا ہے اور اس سے جو نتائج نکالے ہیں۔ ان کی روشنی میں اس کے بارے میں یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ یہ تاریخ اور دیومالائی واقعات کا مجموعہ ہے۔ چونکہ اس کا فارسی ترجمہ 1216ء میں ہوا' لہٰذا اس میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کا تعلق عربوں کے عہد سے نہیں بلکہ بعد کے دور سے ہے۔ مثلاً شحنہ کی اصطلاح سلجوقیوں کے دور سے شروع ہوئی اقطاع آل بویہ کے عہد سے مستعمل ہوا۔ گائے کی کھال میں مجرم کو سلوانے کی روایت منگولوں کی تھی۔

چچ نامہ کا ہیرو محمد بن قاسم 1920ء کی دہائی میں ایک بار پھر بحیثیت ہیرو کے اس وقت ابھرا کہ جب ہندوستان میں فرقہ واریت کا زور تھا۔ اس پس منظر میں مسلمانوں کی جانب سے سندھ ''باب الاسلام'' بن گیا اور محمد بن قاسم نوجوان عظیم جنرل۔ 1947ء تک سندھ کی تاریخ کا یہی نقطہ نظر مسلمانوں میں مقبول رہا۔ یہ 1955ء میں ون یونٹ کے قیام اور سندھی نیشنل ازم کے ابھار کے بعد ٹوٹا۔ سندھ کی تاریخ نویسی میں سندھ کے ان مفتوحین کی آواز کو زندہ کیا گیا کہ جو عربوں کی فتح کے بعد سے خاموش تھی۔ اب محمد بن قاسم جارح اور حملہ آور ہو گیا اور داہر ہیرو۔ سندھ کی تاریخ کی یہ تشکیل نو اس لیے اہم ہے کہ اب یہ تاریخ 12-711 کے بجائے وادی سندھ کی تہذیب سے شروع ہونے لگی ہے۔ سندھ کا وہ قدیم ماضی جو باعث عبرت و شرم تھا' اب وہ قابل فخر ہو گیا ہے۔

(3)

سندھ کی تاریخ پر دوسری اہم کتاب میر محمد معصوم بکھری کی ''تاریخ معصومی'' ہے۔ میر معصوم اکبر بادشاہ کے امراء میں سے تھے۔ جو آخر عمر میں آ کر بکھر (سکھر) میں رہائش پذیر ہوئے' جہاں ان کی تعمیر کردہ عمارات اور ان کا مقبرہ ہے۔

ان کی تاریخ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کو عربوں کی فتح سندھ سے مغلوں کے فتح سندھ تک ایک تسلسل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ سومرو اور سمہ دور کے بارے میں بقول ان کے' مواد نہ ملنے کی وجہ سے وہ ان کی مکمل اور تفصیلی تاریخ نہیں لکھ سکے۔ جیسا کہ اس وقت تاریخ نویسی کا

دستور تھا' مورخ پچھلے عہد کے واقعات ہم عصر تاریخوں سے لے کر انہیں اپنی زبان میں ایک نئے اسلوب سے بیان کر دیتا تھا' وہ ان تمام واقعات کو جو ان ماخذوں میں تھے' انہیں چیلنج نہیں کرتا تھا اور نہ ان کے بارے میں تصدیق کرتا تھا۔ اس لیے جو غلطیاں ہم عصر مورخوں کے ہاں ہوتی تھیں' وہ بعد کے مورخوں کی کتابوں میں بھی اسی طرح سے درج ہو جاتی تھیں' جیسے کہ محمد بن قاسم کو گائے کی کھال میں سلوانے والا واقعہ' جو بغیر تحقیق کے لکھ دیا گیا ہے۔ اس صورت میں تاریخ کا وہ حصہ اہم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے عہد کے بارے میں لکھا ہو۔ اس میں وہ واقعات کا اکثر خود شاہد ہوتا تھا یا راویوں کی زبانی سنے ہوئے حالات کو بیان کرتا تھا۔

میر معصوم کی تاریخ کا جب اس نقطہ نظر سے تجزیہ کیا جاتا ہے تو اس میں عربوں کی فتح سندھ کے سلسلہ میں وہی رائے نظر آتی ہے کہ جو چچ نامہ کے مصنف کی ہے یعنی عربوں کی جنگ کفر اور اسلام کی جنگ تھی' اور جس کی کامیابی حق کی باطل پر فتح تھی۔

کتاب کا دوسرا اہم حصہ ارغونوں اور ترخانوں کا دور حکومت ہے۔ ارغونوں نے سندھ پر حملہ کر کے جو قتل و غارتگری کی' شہروں کو لوٹا اور باشندوں کو ذلیل کیا۔ ان واقعات کا ذکر تو میر معصوم نے کیا ہے' مگر اس کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگوں اور ان کے نتیجہ میں ہونے والی تباہی اور لوٹ مار کو عام سمجھتا ہے' اس لیے ان پر تنقید نہیں کرتا ہے' بلکہ شاہ بیگ ارغون کے لیے لکھتا ہے کہ وہ فطری طور پر رحمدل اور طبعی لحاظ سے مہربان تھا۔ شاہ حسن ارغون کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ ''کسی بھی آدمی پر ظلم اور زیادتی کا ہونا ناممکن بنا دیا'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ہمدردی ارغونوں کے ساتھ تھی۔ انہوں نے سندھ پر جو جارحانہ حملے کیے' اسے فتح کیا' اور اس کا استحصال کیا' وہ اس کے نزدیک حکومت و آئین جہاں بانی کے مطابق تھا۔

اگرچہ اس نے بکھر میں آنے والے مغل گورنروں کی بدعنوانیوں کے بارے میں لکھا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اکبر بادشاہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے فوراً اس کا تدراک کیا۔ مغلوں کے ہاتھوں سندھ کی فتح میں وہ خود بھی شریک تھا' اس لیے اس نے حملہ کی وجہ کو محض یہ بتایا ہے کہ جانی بیگ اکبر کے دربار لاہور میں حاضر نہیں ہوا جسے اکبر نے نافرمائی خیال کرتے ہوئے سندھ کی فتح کا ارادہ کیا۔ مغلوں کے سندھ پر حملہ کی یہ وجہ محض ایک بہانہ تھی۔ کیونکہ جانی بیگ ایک خودمختار حکمراں تھا اور اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ شاہی دربار میں حاضری دے۔ اس کے

پس منظر میں اکبر کی سامراجانہ پالیسی تھی کہ جو اپنے اردگرد کسی بھی خودمختار سلطنت کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری سندھ کی فتح سیاسی اور تجارتی طور پر مغلوں کے لیے ضروری تھی تاکہ افغانستان تک ان کے راستے محفوظ رہیں۔ اس لحاظ سے میر معصوم کی تاریخ مغل دور حکومت اور اس سے ہونے والے نتائج کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں کرتی ہے۔

مغل منصب دار کی حیثیت سے میر معصوم مغلوں کی جانب سے جنگ میں حصہ لیتا رہا' اس لیے اس کی کتاب میں جنگوں کے بارے میں تفصیلاً ذکر ہے' مگر انتظام اور لوگوں کی سماجی و معاشرتی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں انتظامی امور اور معاملات سے زیادہ امراء اور حکمراں طبقہ کو جنگوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔

اس کی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امراء کا طبقہ علماء اور صوفیاء کا احترام کرتا تھا کیونکہ ان لوگوں میں جو عزت تھی اس کے ذریعہ وہ اپنے سیاسی مفادات حاصل کرتے تھے۔ اکثر علماء نے فاتحین کا ساتھ دیا' اور انہیں جو جاگیریں اور وظیفے ملے اس کے سہارے پرامن زندگی گزارتے رہے۔

(4)

تاریخ سندھ میں تیسری اہم کتاب میر علی شیر قانع کی تحفتہ الکرام ہے۔ میر علی شیر قانع کو اپنے وقت کا ایک عالم و فاضل کہا جاتا ہے کہ جنہوں نے شعراء' صوفیاء' علماء اور معاشرے کی اہم شخصیات پر لکھا۔ ان کی کتاب تحفتہ الکرام سندھ کی تاریخ ہے' جو عربوں کی فتح سے لے کر ان کے اپنے عہد یعنی کلوڑا دور تک آتی ہے۔ میر علی شیر قانع کا تعلق سادات سے تھا اور ان کا خاندان سندھ میں آ کر آباد ہوا تھا۔ جیسا کہ اس دور میں دستور تھا' حکمراں سادات سے تعلق رکھنے والوں کو جاگیریں اور وظائف دیا کرتے تھے۔ اس لیے ان کا نقطہ نظر حکومت کے ساتھ ہمدردانہ ہوتا تھا۔ ان کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ایک میں حکمرانوں کی تفصیل ہے' اور دوسرے میں صوفیاء و علماء کی۔ یعنی سندھی معاشرہ ایک طرف حکمرانوں کے تسلط میں تھا جو سیاسی طور پر ان کے حاکم تھے دوسری طرف صوفیاء و علماء نے انہیں اپنے روحانی غلبہ میں لے رکھا تھا۔ لیکن اس تاریخ میں سندھ کے معاشرے کے ثقافتی و سماجی پہلو غائب ہیں۔ اسی طرح اس کتاب میں سلطنت کے

نظم وضبط یا قوانین کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہیں۔

عرب، سومرہ، سمہ، ارغون وترخان اور مغل دورِ حکومت کے بارے میں ان کی معلومات کا ذریعہ قدیم ماخذ ہیں، جیسے چچ نامہ، میر معصوم کی تاریخ سندھ، محمد طاہر نسائی کی تاریخ طاہری اور ارغون نامہ وترخان نامہ۔ اس مواد پر لکھی گئی تاریخ میں نہ حالات وواقعات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور نہ کوئی نئی معلومات دی گئیں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ محض تاریخی معلومات میں جو تاریخی شعور وآگہی پیدا کرنے میں ناکام ہیں۔

بحیثیت تاریخ نویس کے مصنف نے اپنے عہد یا اپنے سے پہلے مورخوں کی تحریروں سے بھی کچھ زیادہ نہیں سیکھا۔ واقعات کی حقیقت اور ان کا تجزیہ کرنے کے بجائے انہوں نے تحریر کو دلچسپ بنانے کی خاطر مافوق الفطرت کہانیاں اور قصے بیچ میں ڈال دیئے ہیں۔ جو شاید اس وقت کے قارئین کے لیے تو باعث دلچسپ ہوں، مگر تاریخ کے طالب علم کے لیے یہ الجھنوں کا باعث ہیں۔ اگر اس تاریخ سے واقعات کا انتخاب کیا جائے اور ان کے اردگرد جو کہانیاں ہیں، انہیں دور کیا جائے تو اس وقت اس تاریخ کی کوئی اہمیت ہوگی۔

اگرچہ وہ خود کلہوڑہ دور میں تھا اور میاں غلام شاہ کلھوڑا کے کہنے پر تاریخ لکھنی شروع کی تھی، اس لیے توقع یہ کی جاتی تھی کہ مورخ اپنے عہد کی تاریخ کو تفصیل سے اور واقعات کو چھان بین کے بعد لکھے گا، مگر اس سے یہ توقع بھی پوری نہیں ہوئی، اس میں بھی اس کے ہاں کوئی خاص بات نہیں ملتی ہے۔

مصنف نے تاریخ میں جگہ جگہ لوک کہانیاں اور داستانیں دے دی ہیں، اگرچہ یہ بیانیہ ہیں اور مصنف نے جو ان کے بارے میں پڑھا یا سنا ہوگا اسے بیان کر دیا ہے۔ تاریخ کا طالب علم ان لوک داستانوں سے اس عہد کے معاشرہ کی ذہنیت کا تجزیہ کر سکتا ہے کہ جو ان داستانوں میں موجود ہے۔ جو داستانیں اس کتاب میں ہیں اور شاید انہیں محض دلچسپی کی خاطر دیا گیا ہے، ان میں سسی پنوں، مارول (ماروی) عمر موہل میندھرا اور پہلا چنید شامل ہیں۔ ان داستانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تاریخ تو نہیں ہیں، مگر ان میں معاشرے کے رویئے اور رجحانات ملتے ہیں۔ مثلاً ایک طرف پدرانہ نظام نے عورت کی حیثیت کو کمتر کر کے اسے روایات میں قید کر دیا تھا، مگر ان داستانوں میں عورتیں معاشرے کی اخلاقی روایات اور قدروں سے بغاوت کرتی ہیں، یہ بغاوت ان کے اندر کی

توانائیوں کو ابھارتی ہے اور انسانی شناخت کو مکمل کرتی ہے۔ لیکن سیاسی بغاوتوں کی طرح یہ سماجی اور ثقافتی بغاوتیں بھی شکست سے دوچار ہوتی ہیں اور ان کا انجام ہمیشہ المیہ پر ہوتا ہے۔ مگر یہ المیہ اس قدر شدید اور گہرا ہوتا ہے کہ شاعر و داستان گو اسے اپنے بیان و کلام سے امر بنا دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں داستانوں کی عورتیں اہم بن کر ابھرتی ہیں اور یہ ایک ایسا روپ اختیار کر لیتی ہیں کہ جو آنے والی نسلوں کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ عورت کو جو مقام سیاسی تاریخ میں نہیں ملا اس کی کمی ان داستانوں نے کر دی ہے۔

لیکن جہاں ان عورتوں کی اخلاقی قدروں سے بغاوت ہے' اور عشق کے اظہار کا برملا اعلان ہے انہیں داستان گو اور شاعران کی پاک دامنی اور عصمت و عفت کو برقرار رکھتے ہوئے عورت کا وہ عکس باقی رکھتے ہیں کہ جو پدرانہ معاشرہ چاہتا ہے۔ عشق ہے گر جنسی بے راہ روی نہیں ہے۔ سندھ کے معاشرے میں عورت کا جو مقام ان داستانوں سے جھلکتا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں برصغیر کی دوسری لوک کہانیوں میں بھی ہے۔

تاریخ نویسی میں ایک روایت چلی آ رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مورخ اپنے عہد کی تاریخ لکھتا ہے تو وہ محتاط ہوتا ہے کہ ایسی بات نہ لکھ دے کہ جو حکمراں یا حکمراں طبقوں کو ناگوار گزرے۔ خصوصیت سے اس زمانہ میں کہ جب بادشاہ مطلق العنان ہوتے تھے' ان کے درباری مورخوں کا فریضہ ہی یہ تھا کہ وہ اپنے سرپرست کی تعریف و توصیف کریں اور اس کے کارنامے بیان کریں۔ مگر وہ اس سلسلہ میں آزاد تھے کہ گزرے حکمرانوں پر تنقید کریں اور ان کے مظالم کو بیان کریں' کیونکہ اس صورت میں ان کی سرزنش کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ میر علی شیر قانع نے بھی اس روایت پر عمل کرتے ہوئے ماضی کے بادشاہوں کے مظالم کو بیان کیا ہے خصوصیت سے ارغونوں کی فتح سندھ اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے مصائب کا ذکر ہے کہ جو سندھ کے عوام نے جھیلے۔

اسلامی تاریخی روایات میں بادشاہوں کی اصلاح کے لیے ایک خاص ادب تخلیق کیا گیا کہ جس میں قابوس کا قابوس نامہ' نظام الملک کا سیاست نامہ' اور غزالی کی نصیحت الملوک اور ضیاء الدین برنی کی فتاوی جہانداری قابل ذکر ہیں۔ اس ادب کے ذریعہ قصہ' کہانیوں اور روایتوں کے ذریعہ حکمرانوں کی اصلاح مقصود تھی۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ جب مورخ پچھلے بادشاہوں کے مظالم کا تذکرہ کرتا تھا اور رعایا کی بے بسی و مجبوری اور لاچاری کی تصویر کھینچتا تھا تو اس سے اس کے

عہد کے حکمراں کتنا سبق سیکھتے تھے مگر یہ واقعات ایک لحاظ سے بادشاہوں کے لیے سبق آموز ضرور تھے۔

مثلاً وہ جب اروڑ شہر کی تباہی کے ذکر کرتا ہے' یا برہمن آباد کی ویرانی کا بیان کرتا ہے تو اس کا سبب وہاں کے حکمرانوں کو قرار دیتا ہے کہ ان کے افعال قبیحہ اور بدعنوانیوں کی وجہ سے یہ شہر برباد ہوئے۔ یہ وہ عہد تھا کہ جب شہروں اور ملکوں کی بربادی افراد کے اعمال سے ہوتی تھی' کیونکہ تمام اختیارات بادشاہ یا گورنر کے پاس ہوتے تھے۔ اگر بااختیار شخص میں خوبیاں ہوتی تھیں تو شہر اور ملک اور لوگ خوشحال و فارغ البال ہوتے تھے' اگر وہ ظالم و جفا جو کینہ پرور اور بخیل ہوتا تھا تو اس سے شہر اور ملک کے عوام متاثر ہوتے تھے۔ اس لیے مفکرین اور دانشوروں کا طریقہ کار یہ تھا کہ ان شخصیتوں کو سدھارا جائے' ان کے کردار کو درست کیا جائے' اور ان میں رعایا کی محبت پیدا کی جائے تاکہ ملک یا شہر آباد رہے۔ اس مقصد کے لیے یہ کہانیاں اور داستانیں کارآمد ہوتی تھیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے ہم پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ افراد کے جو روحانی مشاغل میں مصروف تھے وہ روحانیت سے سیاست میں آئے اور اقتدار پر قبضہ کیا۔ مگر ایسا نہیں ہوا کہ سیاست سے افراد روحانیت کی طرف گئے ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روحانی خاندان کے لوگ اپنے مذہبی ریاضت و عبادت سے لوگوں کے دلوں میں احترام پیدا کر لیتے تھے۔ اس لیے جب یہ سیاست میں آتے تھے تو ان کے مریدان سے تعاون کے لیے تیار رہتے تھے۔ مگر جو صاحب اقتدار ہوتے تھے' ان کے لیے سیاست و حکمرانی چھوڑ خرقہ بزرگی پہننا مشکل ہوتا تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ایران میں صفوی حکمرانوں کی ابتداء پیری مریدی سے شروع ہوئی اور حکمران تک پہنچی۔ یہی صورت حال کلھوڑا خاندان کی تھی کہ جن کے بزرگوں نے پیری مریدی سے ترقی کرتے ہوئے اپنے مریدوں کی مدد سے زمینوں پر قبضہ کرتے ہوئے بالآخر مسند اقتدار تک جا پہنچے۔

جب میر علی شیر قانع سندھ کے قصبات و شہروں کے بزرگوں کا تذکرہ کرتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی تعداد میں یہ بزرگ سندھ میں کیسے پیدا ہو گئے؟ ان بزرگوں کے حالات اور ان کے شہروں و قصبوں کے بارے میں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ایک تو ان بزرگوں کی تھی کہ جو شہروں میں آباد تھے اور جن کی سرپرستی حکمراں اور امراء کرتے تھے۔ دوسرے وہ بزرگ تھے کہ جو شہروں سے دور ان قصبات اور گاؤں میں آباد تھے کہ جو دریا کے کنارے کنارے آباد تھے

اور جہاں زراعت و کاشتکاری ہوتی تھی کہ جس میں سے یہ اپنا حصہ وصول کرتے تھے۔ یا ان شہروں اور قصبوں میں کہ جو تجارتی گزرگاہوں پر تھے۔ ہمیں ایسے بزرگ کم ہی ملیں گے کہ جو کوہستانوں یا بے آب و گیاہ میدانون میں جا کر آباد ہوئے ہوں۔ کیونکہ یہاں مریدوں کے پاس دینے کے لیے بہت کم ہوتا تھا۔ ان بزرگوں کے مرید کاشت کار اور مختلف قبائل کے لوگ ہوتے تھے جو انہیں نذرو نذرانے دیتے تھے۔ اس کے عوض وہ اپنی کراماتوں اور روحانی طاقتوں سے ان کا تحفظ کرتے تھے۔ مثلاً اگر بارش نہ ہو تو اس کے لیے دعائیں کرنا' اگر قحط پڑ جائے تو اسے دور کرنے کے لیے خدا سے التجا کرنا' اگر دشمن حملہ کر دے تو اس سے صلح کر کے لوگوں کو تحفظ دلانا۔ اگر حکومت کے عہدیدار اور عمال بدعنوان ہوں تو ان کی شکایات حکمرانوں تک پہنچانا' وغیرہ۔ یہ بزرگ یہ سماجی خدمات سرانجام دیتے تھے کہ جس کی وجہ سے لوگوں کو ان کی ضرورت رہتی تھی۔ ان بزرگوں کی درگاہیں بھی لوگوں کے لیے زیارت گاہیں تھیں کہ جہاں وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔

اگر تحفۃ الکرام کا اس نقطہ نظر سے تجزیہ کیا جائے تو اس کے ذریعہ معاشرہ کی سماجی زندگی کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔

ان تینوں تاریخوں کے مطالعہ سے جو بات واضح ہو کر آتی ہے کہ اگر تاریخ کو فاتحین کے نقطہ نظر سے لکھا جائے تو مقامی آوازیں دب جاتی ہیں۔ خاص طور سے چچ نامہ کہ جس کے بارے میں اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کا نیا نام ''فتح نامہ'' زیادہ مقبول ہو۔ کیونکہ چچ نامہ میں پھر بھی چچ کے نام کی وجہ سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ وہ اس ملک کا حکمراں تھا کہ جس کے خاندان کو حکمرانی سے محروم کیا گیا۔ چچ اس طرح سندھ کی علامت بن جاتا ہے' اگر اس کے برعکس ''فتح نامہ'' کیا جائے تو تاریخ پر پوری طرح سے عربوں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس سے ان کی برتری اور افضلیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ میر معصوم بھی سندھ کے باشندے سے زیادہ مغل دربار کے امیر و منصب دار کی حیثیت سے تاریخ کو دیکھتا ہے۔ میر شہر علی قانع کا خاندان اگرچہ سندھ میں عرصہ سے مقیم رہا' مگر اسے بھی اپنے خاندانی ہونے پر فخر ہے کہ جس کی جڑیں سندھ سے باہر تھیں۔ اس لیے عربوں کی فتح کے بارے میں وہ چچ نامہ کے نقطہ نظر کو دھراتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس کی تاریخ بہت کمزور ہے کیونکہ اس نے جگہ قصوں اور کہانیوں کے ذریعہ قاری کو الجھا دیا ہے۔ شاید وہ اس طرح سے اپنی

کتاب کو دلچسپ بنانا چاہتا تھا' مگر اس سے تاریخی واقعات مجروح ہوئے ہیں۔

ان تینوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد سندھ کی تاریخ کے بارے میں جو تاثر قائم ہوتا ہے' اول تو یہ کہ جب بھی سندھ کی ایسی حکومت کا صوبہ رہا کہ جس کا مرکز دور تھا تو اس کے نتیجہ میں یہاں گورنروں اور صوبیداروں نے اپنی من مانی کارروائیاں کیں۔ چونکہ مرکز دور ہوتا تھا اور ان پر نگرانی کرنے والا یا ان کا احتساب کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا' یہ صورت حال عربوں اور مغلوں کے عہد میں بہت زیادہ ہوئی کہ جس کا تذکرہ ہم عصر تاریخوں میں ہے۔ سندھ میں مغل گورنروں کے بارے میں میر معصوم نے بھی لکھا ہے کہ انہوں نے بااختیار ہو کر جو چاہا وہ کیا۔ اگر مرکز تک ان کی بدعنوانیوں کی خبر پہنچی تو بہت ہوا تو یہ کہ ان کو معزول کر کے دوسرا صوبیدار بھیج دیا۔ مگر بدعنوانیوں کی وجہ سے سزا نہیں دی۔

دوسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ جب بھی غیر ملکی حملہ آور آئے تو ان کے ساتھ مقامی طور پر تعاون کرنے والے ان کا ساتھ دینے والے اور ان کی مدد کرنے والے سندھی معاشرے سے آئے جنہوں نے اپنے مفادات کی خاطر اپنے ہی ملک کی فتح میں ان کا ساتھ دیا۔ ان میں امراء' علماء اور قبیلوں کے سردار شامل ہوا کرتے تھے۔ ہم عصر تاریخوں میں تعاون کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے' ان پر کہیں غداری کا الزام نہیں لگایا گیا ہے۔

یہ تینوں تاریخیں جن کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوا ہے' سندھ کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔

(5)

قوموں کی تاریخ میں جنگ و جدل اور بیرونی حملہ آوروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اندرونی طور پر حکمراں خاندان اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ دوسرے علاقوں کی خودمختاری ختم کر کے اسے مرکزی حکومت کے ماتحت لے آئیں' اس سلسلہ میں خانہ جنگیں ہوتی تھیں۔ اگر مرکزی حکومت فوجی لحاظ سے مضبوط و مستحکم ہوتی تھی تو وہ علاقائی سرداروں اور حکمرانوں کو شکست دے کر انہیں ماتحت بنا لیتی تھی' ورنہ ملک سیاسی طور پر تقسیم رہتا تھا۔ یہ خانہ جنگیاں معاشرے کی توانائیوں کو ضائع کرتی تھیں۔ جنگوں کی وجہ سے نہ صرف جانی و مالی نقصان ہوتا تھا بلکہ لوگوں میں

عدم تحفظ کا احساس بھی پیدا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے لوگ ہجرت کر کے محفوظ علاقوں میں جاتے تھے۔ جو نہیں جا سکتے تھے وہ لاقانونیت اور بدعنوانیوں کے ہاتھوں برباد ہوتے تھے۔ ایک مستحکم سیاسی حکومت لوگوں کو نہ صرف امن وامان دیتی تھی بلکہ معاشرہ معاشی وسماجی طور پر بھی ترقی کرتا تھا۔ کیونکہ استحکام کی صورت ہی میں حکمراں اس قابل ہوتے تھے کہ وہ رعایا سے ٹیکس وصول کر سکیں اور اس کی آمدن سے وہ اپنے دربار کو شاندار بناتے تھے۔ شعراء وعلماء کی سرپرستی کرتے تھے' دستکاروں اور ہنرمندوں سے اپنی ضروریات کی اشیاء تیار کراتے تھے۔ اس دور میں شہروں کی آبادی بڑھتی تھی اور شہری کلچر پیدا ہوتا تھا۔

دوسری صورت حال میں جس سے قومیں متاثر ہوتی تھیں وہ بیرونی حملہ آور ہوتے تھے۔ اگر وہ فتح یاب ہو جاتے تھے تو وہ ریاست کے پورے ڈھانچہ کو بدل دیتے تھے۔ حکومت کے اہم عہدوں پر ان کے ساتھ آنے والے غیر ملکی ہوتے تھے' اس صورت میں مقامی لوگ پس پردہ چلے جاتے تھے۔ سوائے اس جماعت کے کہ جو ان کے ساتھ تعاون کرتی تھی۔ اس نئے طرز حکومت میں حکمراں طبقوں اور عوام میں فاصلے بڑھ جاتے تھے۔ اس لیے عوام پر تسلط قائم کرنے کے لیے فوجی طاقت وقوت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اگر ان کے خلاف بغاوت ہوتی تھی تو اسے سختی سے کچل دیا جاتا تھا۔ اگر کسان ریونیو دینے میں دیر کرتے یا مزاحمت کرتے تو اس کا سختی سے نوٹس لیا جاتا تھا۔

بیرونی حملہ آوروں کا دوسرا اثر مقامی کلچر پر ہوتا تھا۔ بیرونی حملہ آور اپنے ساتھ جو نئی ثقافت اور نئے رجحانات لاتے تھے ایک طرف تو وہ مقامی کلچر سے مل کر ایک ایسے کلچر کو پیدا کرتے تھے کہ جس میں توانائی ہوتی تھی' مگر دوسری طرف مقامی کلچر سرپرستی سے محروم ہو کر کمزور بھی ہو جاتا تھا اور سمٹ کے یہ شہرون کے بجائے گاوؤں اور دیہاتوں میں پناہ لے لیتا تھا۔

سندھ کی تاریخ بھی ان دونوں عوامل سے گزری۔ آپس کے اختلافات نے بھی اس کے معاشرے کی تبدیلی میں حصہ لیا اور بیرونی حملہ اور بیرونی حکمرانوں نے بھی اس کے کلچر اور روایات کو بدلا۔ اور اس طرح اس شناخت بار بار تبدیل ہوتی رہی۔

جب شمالی ہندوستان میں مسلمان حکمراں خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں تو اسکے بعد سے سندھ کی تاریخ کو دہلی کے نقطہ نظر سے دیکھا جانے لگا۔ ارغونوں اور ترخانوں کی حکومت (1520

سے 1592) بیرونی حملہ آوروں کی حکومت تھی جنہوں نے سمہ خاندان کو بے دخل کر کے حکومت پر قبضہ کیا تھا۔ ترخانوں کی شکست کے بعد سندھ مغلوں کے تسلط میں آ گیا۔ اکبر اگرچہ ایک روشن خیال اور وسیع النظر حکمراں تھا مگر اسکے ساتھ ہی وہ اک بڑا امپریلسٹ بھی تھا کہ جس نے عظیم سلطنت قائم کرنے کی غرض سے چھوٹی ریاستوں کو اس میں ضم کر دیا۔ سندھ پر حملہ اس سلسلہ کی ایک کڑی تھا(1592) لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تصادم میں کس کو صحیح ٹھہرایا جائے؟ ارغون وترخان بھی بیرونی حملہ آور تھے اور مغل بھی کہ جنہوں نے سندھ کو فوجی طاقت سے قبضہ میں لیا تھا۔ کیا اس صورت میں دونوں بیرونی حملہ آور قابل مذمت ہیں؟

اٹھارویں صدی میں جب مغل خاندان کے زوال کے ساتھ کلھوڑا خاندان (1700 سے 1782) برسر اقتدار آیا تو وہ بھی سندھ کو ایک خودمختار سلطنت قائم کرنے میں ناکام رہا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے اسے کابل کا باجگزار بنا دیا۔ یہاں تک کہ ٹالپروں عہد میں (1759-1843) میں سندھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔ اس بار سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی میں شامل کر کے اس کی خودمختار حیثیت کو ختم کر دیا گیا۔

اس تاریخی عمل نے سندھ کی تاریخ کو الجھا دیا ہے۔ یہ کبھی عربوں کے نقطہ نظر سے لکھی گئی تو کبھی ارغونوں اور ترخانوں کے اور کبھی مغلوں اور انگریزوں کے۔ اس لیے سندھ کی تاریخ کی تشکیل نو ایک ضرورت ہے جو تاریخ کو ان الجھنوں سے نکالے اور ایک واضح نقطہ نظر سامنے لائے۔

جب بھی کوئی خاندان حکومت پر تسلط قائم کرتا تھا تو تاریخ کو اپنے نقطہ نظر سے لکھواتا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے شکست خوردہ خاندان یا قوم اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے جب ارغون اور ترخان حکمراں ہوئے تو سمہ خاندان تاریخ کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔ اس کا دفاع کرنے والا کوئی مورخ نہیں رہا' یہی صورت حال ارغونوں اور ترخانوں کی حکومت کے خاتمہ پر ہوئی کہ تاریخ کو مغلوں کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ جب کلھوڑوں کا زوال ہوا اور ٹالپر حکمراں ہوئے تو ٹالپر دور کے مورخوں نے کلھوڑوں کو مورد الزام ٹھہرایا کہ انہوں نے ٹالپر سرداروں سے غداری کی' ان کے خلاف سازش کی اور انہیں اس قدر ستایا کہ مجبور ہو کر انہوں نے کلھوڑوں کے خلاف جنگ کی۔ ٹالپروں کے دور حکومت میں سندھ کی وہ سیاسی وحدت ختم ہو گئی

کہ جو کلھوڑا دور میں تھی اب سندھ تین حصوں میں تقسیم ہو گیا: حیدرآباد، میر پور خاص اور خیر پور۔ چونکہ ٹالپر سردار قبائلی ذہنیت رکھتے تھے' اس لیے انہوں نے ملک کو بھی اسی انداز سے چلایا۔ غیر بلوچوں کے ساتھ ان کا رویہ غیر ہمدردانہ تھا بلوچ سردار اب جاگیروں پر قابض ہو گئے۔ میروں نے جگہ جگہ زراعتی کھیتوں کی جگہ شکارگاہیں مقرر کر دیں' جس کی وجہ سے ملک کی آمدنی بھی متاثر ہوئی۔ جب انگریزوں سے سندھ پر قبضہ کیا تو انہوں نے اس دور کی تمام خرابیوں کو اجاگر کر کے اپنے قبضہ کا جواز پیش کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ ٹالپروں نے سندھ کو تقسیم کر کے اسے بے حد کمزور کر دیا اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزوں کو اس پر قبضہ کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔

(6)

سندھ کی تاریخ میں ایک اور اہم پہلو ہے۔ اگرچہ سندھ پر 12-711ء میں عربوں نے قبضہ کر لیا اور عربوں کا سندھ پر تسلط ہباری خاندان (55-854 سے 11-1010) کے خاتمہ تک رہا۔ اس عرصہ میں سندھ کے عرب دنیا سے تعلقات بھی رہے۔ ایک بڑی تعداد عربوں کی سندھ میں آکر آباد بھی ہوئی۔ مگر عربی اقتدار اور تسلط کے باوجود وہ اس علاقہ کو عربی تہذیب ثقافت میں ضم نہیں کر سکے جیسا کہ انہوں نے اپنے مغربی علاقوں میں کیا تھا (مصر' تیونس' الجزائر' مراقش وغیرہ) کہ جہاں عربی زبان اور عرب کلچر ان پر چھا گیا۔

جب شمالی ہندوستان میں سلاطین اور مغلوں کی حکومتیں قائم ہوئیں تو یہ لوگ ہندوستان میں ایرانی کلچر اور فارسی زبان کو ساتھ لائے۔ بعد میں یہی ایران کلچر اور فارسی زبان سندھ میں غالب آ گئی اور اس نے عربی کلچر کے تسلط کو ختم کر دیا۔ فارسی دربار کی زبان ہو گئی۔ وسط ایشیا اور ایران سے آنے والوں نے اس کلچر کے فروغ میں حصہ لیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ سندھ میں فارسی زبان و ادب کی ترقی ہوئی اور صوفیا کے نظریات کو مقبولیت ملی۔

چونکہ فارسی زبان و ادب نے عرب کلچر سے بغاوت کی اور ایران قومیت کو ابھارا اس لیے ان کے ہاں بغاوت اور انحراف کی روایات ہیں۔ مذہبی تنگ نظری اور عقائد کی انتہا پسندی کی جگہ روشن خیالی اور انسان دوستی کے جذبات ہیں۔ اس کلچر نے سندھ کے معاشرہ میں علماء کے اثر کو کمزور کیا

اور انہیں صوفیا کے زیر اثر لانے میں مدد کی۔ سندھ کے حکمرانوں نے بھی صوفیا کی سرپرستی کی اور علماء کو حاشیہ پر رکھا۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ سندھ نے عربی اور ایران ثقافتوں کے تسلط کے باوجود اپنی مقامی شناخت کو برقرار رکھا۔ کیونکہ عربی اور فارسی عوام کی زبانیں نہیں بن سکیں۔ وہ دربار اور مذہبی اداروں تک محدود رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سندھ کی آبادی مختلف قبائل میں بٹی ہوئی دیہاتوں اور ریگستانوں میں بکھری ہوئی تھی کہ جہاں ان کا تعلق حکمرانوں اور امراء کے طبقوں سے کم ہی ہوتا تھا۔ ان میں سے جو قبائل خانہ بدوش تھے وہ حکومت کے تسلط سے تقریباً آزاد تھے اور متحرک رہنے کی وجہ سے وہ حکومت اور اس کے قوانین کی پرواہ نہیں کرتے تھے (اسی وجہ سے تاریخ مظہر شاہ جہاں میں انہیں لیٹرا' اور چور کہا گیا ہے) جن علاقوں میں زراعت ہوتی تھی' وہاں حکومت مقامی سرداروں یا زمینداروں کے ذریعہ ان سے معاملات طے کرتی تھی۔ اس لیے درباری اور امراء کے کلچر کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور انہوں نے اپنی مقامی کلچر کو زندہ رکھتے ہوئے اپنی شناخت کو برقرار رکھا۔ اس لیے تاریخ کے اس پیچ در پیچ عمل میں سندھی زبان اور کلچر کا تحفظ دیہات اور خانہ بدوش قبائل نے کیا۔ جب کہ شہر کے رہنے والوں نے خود کو بیرونی کلچر میں ضم کر دیا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے سندھ کی تاریخ کی تشکیل نو کی جائے تاکہ وہ لوگ جنہیں تاریخ میں نظر انداز کر دیا گیا ہے' اس کے کردار اور ان کے عمل کو اجاگر کر کے انہیں تاریخ میں جگہ دی جائے۔



عربوں کی فتح سندھ

اسلام کے ابتدائی زمانے میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں سندھ پر حملے ہوئے لیکن حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے ان میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت کی سیاسی فضا بھی اس کے لیے مناسب نہیں تھی۔ مسلمانوں کی فوجیں دوسرے اہم محاذوں پر برسرِ پیکار تھیں۔ سندھ کے بارے میں ان کی معلومات محدود تھیں۔ اور ایسی دور دراز مہم پر فوج کو بھیجنا اس کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت تک سندھ کی اہمیت بھی واضح نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ جب سندھ کی سرحدیں ان کی سرحدوں سے ملیں' سیاسی حالات بدلے' تو اس وقت ایسے حالات پیش آئے جن کی وجہ سے سندھ کی فتح مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہوگئی۔

فتح سندھ

سندھ کی فتح میں کون سے عوامل کام کر رہے تھے' سیاسی یا اقتصادی؟ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمانوں کی فتوحات جہاں ان کے سیاسی تسلط کو وسعت دے رہی تھیں وہاں مالِ غنیمت' جزیہ اور خراج سے ان کی خوشحالی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ فاتح' مفتوح علاقوں میں آباد ہو کر وہاں کی زمینوں اور وسائل دولت سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ سندھ کی فتح کا زمانہ خلیفہ ولید (715-705) کا زمانہ ہے جب کہ خلافت کے مشرقی صوبوں کا گورنر حجاج ثقفی تھا۔ اس کے نزدیک اموی خاندان کا استحکام اور ان کی قوت و طاقت میں اضافہ سب سے بڑا مقصد تھا۔ وہ انتہائی کامیابی کے ساتھ وسط

ایشیا میں مہمات کی نگرانی کر رہا تھا۔ اور اس کے نزدیک خلافت بنی امیہ کی وسعت ہر اس علاقہ میں ضروری تھی۔ جہاں مسلمان قوت و طاقت کے ذریعہ کامیابی حاصل کر سکیں' ساتھ ہی یہ بھی اس کا کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے علاقہ میں امن و امان قائم رکھا اور ہر طبقہ کے مفادات کا تحفظ بھی کیا۔

سندھ پر حملے کی وجوہات میں' البلاذری نے فتوح البلدان میں اور چچ نامہ کے مصنف نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو دیبل میں پیش آیا۔ مسلمانوں کے تجارتی جہاز' جن میں عورتیں اور بچے بھی سوار تھے' سراندیب (سیلون) سے آتے ہوئے دیبل کے مقام پر جو راجہ داہر کا علاقہ تھا لوٹے گئے۔ جب عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا گیا تو اس وقت ایک لڑکی نے حجاج سے مدد مانگی۔ حجاج کو اس کی اطلاع ملی تو اس سے متاثر ہوا اور فوراً سندھ کی فتح کے لیے مہمات بھیجنی شروع کیں۔(1)

البلاذری اور چچ نامہ کے اس واقعہ کو بعد کے آنے والے مورخین نے اسی طرح سے نقل کیا ہے' اور اسے سندھ پر حملہ کرنے کی وجہ بتایا ہے۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے ''آئینہ حقیقت نما'' میں جہاں سندھ کی فتح کے دوسرے اسباب پر روشنی ڈالی ہے وہاں اس واقعہ کو سندھ کی فتح کا سب سے اہم جواز بتایا ہے۔

> ''اب ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے حملہ آوری کا استحقاق پیدا ہو گیا تھا یا نہیں' اگر اب بھی اسلامی لشکر حملہ آور ہونے سے تامل کرتا' اور اپنے قیدیوں کو چھڑانے اور راجہ داہر کو سزا دینے میں تساہل سے کام لیتا تو اس سے بڑھ کر سلطنت اسلامیہ کے وقار کو نقصان پہنچانے والی دوسری بات نہیں ہو سکتی تھی۔''(2)

اگر اس واقعہ کا جائزہ لیا جائے اور حجاج کی شخصیت کو سامنے رکھا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر سندھ کے راجہ داہر کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی خرابی کی وجہ صرف یہ واقعہ ہوتا اور دوسرے سیاسی اسباب نہیں ہوتے تو کیا صرف ایک لڑکی کی فریاد حجاج کو اس قدر متاثر کر سکتی تھی کہ وہ سندھ پر ایک بڑی فوج خلیفہ کی مرضی کے خلاف اور مالی مشکلات کے باوجود بھیجتا۔ حجاج ایک زبردست سیاستدان تھا اور سیاست میں جذبات کی رو میں بہہ کر خطرناک کام نہیں کیے جا سکتے۔ حجاج نے اپنے دور حکومت میں جس طرح لاکھوں افراد کو جیل میں ڈالا اور ہزاروں لوگوں کو قتل کرایا۔ اس کے لیے ایک لڑکی کی فریاد کی کیا اتنی اہمیت ہو سکتی ہے؟ لیکن حملہ کی سب سے بڑی

وجہ اسی واقعہ میں ہے اور یہ وجہ مسلمان عورتوں اور بچوں کی حفاظت یا انسانی جذبات نہیں بلکہ سیاسی واقتصادی ہے۔ یہ تجارتی جہازوں کی لوٹ ہے جو حملے کا محرک ہوئی۔ مسلمان تاجر اس وقت تک تجارت کی غرض سے ہندوستان کے ساحلی علاقوں تک آتے جاتے تھے اور جگہ جگہ ان کی نوآبادیاں واقع تھیں۔ جزیرہ سراندیب میں بھی ان کی نوآبادی تھی اور تجارتی تعلقات قائم تھے۔ تجارتی جہازوں کو سمندر میں لوٹ لینے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد یہ بات یقینی ہے کہ مسلمان تاجروں میں زبردست پریشانی اور ہیجان پیدا ہوا ہوگا اور اس بات کا خطرہ حکومت کے سامنے آیا ہوگا کہ اگر سمندری راستے کی حفاظت نہیں کی گئی تو ان کی تجارت پر اس کا اثر ہوگا۔ حجاج نے بھی ایک سیاستدان کی حیثیت سے اس بات کا اندازہ لگایا ہوگا' اس لیے اس نے راجہ داہر سے خط وکتابت کر کے جہازوں کی لوٹ کے بارے میں استفسار کیا' لیکن راجہ داہر نے سرے سے اس بات ہی سے انکار کر دیا کہ یہ جہاز اس کے اشارے پر لوٹے گئے۔ (3) اس لیے حجاج کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ سندھ پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لے تاکہ دیبل کی بندرگاہ اور سمندر کا راستہ مسلمان تاجروں کے لیے محفوظ ہو جائے۔

مسلمان عورتوں اور بچوں کی گرفتاری' ایک لڑکی کی فریاد ایک ایسا واقعہ تھا جس سے مسلمان عوام کی اکثریت کو قومی جوش دے کر فوج میں شامل ہونے کی تلقین کی جا سکتی تھی۔ اور اس واقعہ کی تشہیر سے ان میں راجہ داہر کے خلاف جوش اور نفرت بھی پیدا کی جا سکتی تھی۔ اس لیے اس واقعہ کو اس قدر اہمیت دی گئی اور بعد میں آنے والے مورخین نے اسے سندھ کی فتح کا سب سے بڑا اور اہم جواز سمجھا لیکن حالات کے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے پس منظر میں تجارتی مقاصد تھے' جو سندھ کے فتح ہونے کے بعد ہی پورے ہو سکتے تھے۔ سندھ کی فتح کے بعد کے حالات نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اس سے مسلمان تاجروں کو جو تحفظات ملے' ان سے ان کی تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ اور دیبل کی بندرگاہ اور بحری راستہ کے محفوظ ہونے کے بعد وہ بلاخوف وخطر ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں آتے جاتے رہے۔

سندھ میں اسلام پھیلنے کی وجہ

سندھ میں اسلام جس قدر تیزی کے ساتھ پھیلا' یہ بھی مورخین کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ

ہے۔ اس لیے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجوہات تھیں۔ جب کہ محمد بن قاسم سے لے کر دوسرے گورنروں اور بعد میں خود مختار حکمرانوں کے زمانہ تک مسلمانوں کا مقصد سندھ میں سیاسی طور پر قبضہ کرنا اور حکومت کرنا تھا۔ محمد بن قاسم نے سندھ کی فتح کے بعد نہ تو کسی کو بجبر مسلمان کیا اور نہ ہی حکومت کی جانب سے کوئی تبلیغی کام ہوا لیکن اس کے باوجود لوگ کثرت کے ساتھ مسلمان ہوئے۔

اس کے مقابلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ شمالی ہندوستان میں جہاں صدیوں تک اسلامی حکومت رہی وہاں اسلام کا غلبہ نہیں ہوا اور صوفیہ کی تبلیغ، حکومت کے اثر اور سیاسی وجوہات سے بہت کم لوگ مسلمان ہوئے۔ سندھ اور شمالی ہندوستان میں اسلام کے بارے میں یہ دو متضاد تصویریں سامنے آتی ہیں۔

سندھ میں اسلام پھیلنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں مسلمانوں کی آمد کے وقت اکثریت بدھ مذہب کو ماننے والی تھی۔ بدھ مذہب ایک فلسفیانہ طرز کا مذہب ہے، جس میں وسعت و کشادگی اور رواداری ہے۔ اس کے مقابلہ میں شمالی ہندوستان میں ہندو مذہب کا زور تھا، جسے صدیوں کی روایات نے انتہائی پختہ بنا دیا تھا۔ اس لیے اس کے عقائد میں سختی اور شدت تھی۔ یہ اس کے پیروؤں کے ذہن و دماغ میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے تھا، جو ہر نئی چیز سے دور بھاگتے تھے۔ اس لیے شمالی ہندوستان میں اسلام، سیاسی طاقت کے باوجود، غلبہ نہیں پا سکا۔

سندھ اور شمالی ہندوستان میں ایک فرق یہ تھا کہ سندھ میں قبائلی نظام تھا، جس میں برہمن ذات کو تسلط اور غلبہ حاصل نہیں تھا، اس لیے جب قبیلہ کا سردار مسلمان ہو جاتا تھا تو اس کے ساتھ پورا قبیلہ بھی اسلام قبول کر لیتا تھا۔ چچ نامہ میں اس کی بہت سی مثالیں دی گئیں ہیں۔ اس کے مقابلہ میں شمالی ہندوستان ذات پات کا معاشرہ تھا کہ جہاں سماج پر برہمن طبقہ کا پورا پورا تسلط تھا۔ جس نے مذہبی رسومات اور رویوں کے ذریعہ ہر ذات پات والے کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، اس لیے اس ماحول میں اسلام وہاں پیش رفت نہ کر سکا۔ جب کہ سندھ کے ایک کھلے معاشرے میں کہ جہاں سماجی بندھن اس قدر مضبوط نہیں تھے اور مذہبی طبقے کی بالادستی نہیں تھی وہاں اسلام کو داخل ہونے میں دقت پیش نہیں آئی۔

سندھ اور عربی زبان

سندھ کی فتح، سندھ میں عربوں کی آمد ان کی حکمرانی اور ان کے تسلط کے ساتھ ساتھ یہاں عربی زبان بھی یقیناً آئی ہوگی، لیکن یہ کیا وجہ تھی کہ سندھ کے عوام میں عربی زبان مقبول نہیں ہوئی اور یہاں کی اکثریت نے اپنے علاقے کی زبان کو ترک نہیں کیا۔ جبکہ شمالی افریقہ اور اسپین تک کے علاقے جو عربوں نے فتح کیے تھے انہوں نے وہاں تہذیبی و ثقافتی طور پر اس قدر اثر ڈالا کہ ان کی قومی زبانیں ختم ہوگئیں اور عربی کا رواج ہوا اور ان کی مادری زبان عربی ہوگئی۔

اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے جب ہم مسلمانوں کی شمالی علاقہ میں فتوحات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی فتوحات کے ساتھ ساتھ عربی زبان عراق تک آتی ہے لیکن ایران، خراسان اور وسط ایشیا کے علاقوں میں عربی زبان مقبولیت حاصل نہیں کرسکی اور قدیم فارسی زبان یا دوسری زبانیں قائم رہیں۔ عربی زبان کی اہمیت مسلمان ہونے کے بعد ان علاقوں میں صرف مذہبی زبان کی تھی۔ سندھ میں عربی زبان بھی اس وجہ سے نہیں آسکی، اس کا عرب علاقہ سے بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس لیے یہاں کی مقامی زبان عوام میں باقی رہی۔ اس ضمن میں ایک دوسرا سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ سندھ میں جو مسلمان آباد ہوئے اور جن کی وجہ سے سندھ کی تہذیبی و ثقافتی زندگی متاثر ہوئی ان میں اکثریت عربوں کی تھی یا غیر عربوں کی؟ سندھ میں عربی زبان کے عوامی زبان نہ ہونے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان نو آباد کاروں میں اکثریت غیر عرب مسلمانوں کی تھی۔

حوالے

1- البلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر۔ فتوح البلدان، اردو ترجمہ ابوالخیری مودودی، کراچی 1962ء ص 618

2- اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔ آئینہ حقیقت نما۔ کراچی 1958ء ص 104

3- ایضاً۔ ص 104



الکزنڈر ہملٹن کے مشاہدات سندھ

الکزنڈر ہملٹن 1699 ء میں سندھ آیا تھا' اپنے مشاہدات اور
تاثرات اس نے اپنی کتاب (A New Account of the East
India. Clalan 1930) میں لکھے ہیں یہ مضمون اس کتاب کے
گیارہویں باب کا ترجمہ ہے۔

سندھ مغل امپائر کے انتہائی مغرب میں ساحل سمندر پر واقع صوبہ ہے لاہری بندر اس کی بندرگاہ ہے۔ یہ بندرگاہ اس قابل ہے کہ یہاں 200 ٹن تک کے جہاز آ سکتے ہیں۔ اس سے ملحق ایک گاؤں ہے کہ جس میں 100 مکانات ہیں' جو کہ گارے مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن یہاں پر ایک پتھروں سے بنا ہوا قلعہ بھی ہے' جس پر چار یا پانچ توپیں ہیں تا کہ اس تجارتی سامان کی بلوچی اور مکرانی ڈاکوؤں سے حفاظت کی جا سکے جو کہ اس کے قریب ہی آباد ہیں۔ سرحدی علاقوں میں رہنے کی وجہ سے ان کو چوری چکاری کی عادت ہے۔ یہ ہر اس شخص کو لوٹ لیتے ہیں کہ جو ان کے قابو میں آ جاتا ہے۔ بلوچی ایران سے بغاوت کر کے یہاں آئے ہیں' جب کہ مکرانی مغلوں کی رعایا ہیں۔ جب فوج ان کی سرکشی کو دبانے کے لیے آتی ہے تو اس وجہ سے بچ جاتے ہیں کہ ان کا علاقہ جہاں یہ رہتے ہیں وہ دلدلی ہے۔ یہ اپنے حکمراں کے احکامات یا قوانین کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا پیشہ ہے کہ یہ ان قافلوں کو لوٹتے ہیں کہ جو ٹھٹھہ اور لاہری بندر کے درمیان آتے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان قافلوں کی حفاظت کے لیے 200 گھڑسواروں کا دستہ ہوتا ہے جو کہ ٹھٹھہ کا نواب یا گورنر ان کے ساتھ بھیجتا ہے۔ لیکن اکثر قافلوں کے یہ حفاظتی دستے ان

لٹیروں کے ہاتھوں قافلوں کو لٹنے دیتے ہیں' وہ یہ بہانہ کرتے ہیں کہ وہ ان کی تعداد کے آگے بے بس ہیں' لیکن بعد میں انہیں لٹیروں سے لوٹ کے مال سے حصہ مل جاتا ہے۔

ٹھٹھہ اس صوبہ کا تجارتی مرکز ہے' اور اس لحاظ سے بڑا دولت مند شہر ہے۔ لمبائی میں یہ تین میل کے اندر پھیلا ہوا ہے۔ چوڑائی اس کی ڈیڑھ میل کی ہوگی۔ لاہری بندر سے یہ 40 میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس کے مغرب میں ایک بڑا قلعہ ہے۔ اس میں 500 آدمیوں اور گھوڑوں کی رہائش کی سہولت ہے۔ یہاں لوگوں کے رہنے کے لیے بیرکس اور گھوڑوں کے اصطبل ہیں۔ نواب کے لیے ایک بڑا محل ہے۔ وہ تمام تجارتی سامان جو ٹھٹھہ سے لاہری بندر آتا جاتا ہے اس کے لیے اونٹوں' بیلوں اور گھوڑوں کی گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ تمام علاقہ میدانی ہے اور جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ یہ جھاڑیاں لٹیروں کو چھپانے کا کام دیتی ہیں کہ جہاں سے نکل کر اچانک وہ قافلے پر حملہ کرتے ہیں۔ اس وقت جب کہ حفاظتی دستہ کسی ایک جگہ لڑائی میں مصروف ہوتا ہے۔ لٹیرے گاڑیوں کو معہ ان کے سامان کے ہنکا کر لے جاتے ہیں۔ 1699ء میں چار یا پانچ ہزار بدمعاشوں کے جتھے نے ایک مال و دولت سے بھرے ہوئے قافلے کو لوٹا تھا۔ اس کا حفاظتی دستہ جو کہ 250 گھڑسواروں پر تھا' وہ تمام کا تمام قتل ہوا۔ 500 تاجر اور سامان اٹھانے والے جو اس قافلہ کے ساتھ تھے' جب وہ لٹے پٹے ٹھٹھہ آئے تو انہوں نے لوگوں کو بے انتہا خوف زدہ کر دیا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اس واقعہ کے چار مہینہ بعد لاہری بندر آیا میں جس کارگو کے ساتھ آیا اس کی مالیت 11000 تھی۔ مجھے یہاں ٹھٹھہ کا کوئی ایسا تاجر نہیں ملا کہ جو میرے سامان کی ٹھٹھہ پہچانے سے پہلے قیمت لگاتا۔ لیکن وہ اس لیے تیار ہوگئے کہ میرے پاس جو مصالحہ جات ہیں۔ ان کی بولی لگا دیں۔ لہٰذا میرے لیے اس کے علاوہ اور کوئی دوسری صورت نہیں تھی کہ میں خشکی کے راستے ٹھٹھہ کے لیے ایک قافلے میں سفر کروں کہ جس میں 1500 مویشی اور جانور تھے اور ان سے بھی زیادہ مرد و عورتیں تھیں۔ حفاظت کے لیے 200 سواروں کا دستہ تھا۔ یہ کوئی جنوری کا نصف تھا کہ ہم سفر پر روانہ ہوگئے۔ ابھی ہم کوئی 16 میل گئے ہوں گے کہ ہمارے مخبروں نے آ کر خبر دی کہ ایک بڑی تعداد میں بلوچی اور مکرانی لٹیرے ہمارے انتظار میں ہیں۔ میرے پاس تیرہ بندوقچی تھے جو کہ اگلی صف میں میرے مویشیوں کے ساتھ تھے ہم سب چھوٹے گھوڑوں پر سوار تھے۔ یہ خبر سن کر ہم سواری سے اترے اور جانوروں کو اپنے سامنے اور دائیں بائیں رکھا تا کہ

وہ ہمارے لیے حفاظتی دیوار کا کام دیں اور اس طرح ہم لٹیروں کی تلواروں اور نشانوں سے محفوظ رہیں، لیکن ہم نے اتنی کھلی جگہ رکھی کہ جہاں رہتے ہوئے لٹیروں پر فائر کرسکیں۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ لٹیروں نے ایک شخص کو ہماری جانب خبر لینے بھیجا جو کہ گھوڑے پر سوار ننگی تلوار لہراتا ہوا آیا اور قریب آ کر اس نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر ہم نے ہتھیار نہیں ڈالے اور سامان ان کے حوالے نہیں کیا تو ہماری حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں دی جائے گی۔

میرے پاس دو جہاز راں تھے جن کو میں نے جہاز میں ایک پرندے کا ایک ہی شاٹ میں شکار کرتے ہوئے دیکھا تھا جو کہ جہاز کے اوپر اڑ رہا تھا اس سے مجھے اندازہ تھا کہ ان کا نشانہ خطا نہیں ہوتا ہے ان میں سے میں نے ایک سے کہا کہ اس مخبر کو شوٹ کر دے، اس نے اس پر فوراً عمل کیا اور گولی اس کے سر میں سے ہو کر گزر گئی۔ ایک اور جو اس کے پیچھے آ رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا اس کو بھی اس قسم کی موت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد آنے والے کے بارے میں میں نے ہدایت دی کہ اس کے گھوڑے کے سر میں گولی ماری جائے تاکہ ہم اس کے سوار کو قابو میں لا سکیں اور اس کے ذریعہ دشمنوں کی قوت کا اندازہ لگا سکیں۔ گھوڑا جیسے ہی سامنے آیا اسے شوٹ کر دیا گیا، اس کے بعد ہمارے کچھ سواروں نے لٹیرے کو میرے پاس لانے کے بجائے گرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب ہمارا حفاظتی گھڑ سواروں کا دستہ عقب میں تھا، لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ قافلہ کے سامنے والے حصہ میں کیا ہو رہا ہے، تو انہوں نے ہمت کی اور جھاڑیوں میں گھس کر ان لٹیروں کو مار بھگایا جو کہ ہمارے دائیں بائیں حملے کی تیاری میں تھے۔ اس پورے آپریشن سے یہ لٹیرے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے، ہمارے گھڑ سواروں نے ان بھاگتے ہوئے لٹیروں میں سے کچھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب حفاظتی دستہ تعاقب کے بعد واپس آیا تو ہم نے اپنے سفر کا دوبارہ سے آغاز کیا۔ تقریباً 4 میل سفر کرنے کے بعد ہم ایک کچے قلعے پہنچے یہ لاہری بندر اور ٹھٹھہ کے درمیان واقع ہے، یہاں ان قافلوں کے ٹھہرنے کے انتظامات ہیں کہ جو آگے کی جانب سفر کرنا چاہتے ہیں۔ رہائش کی تنگی کی وجہ سے یہاں انسان اور مویشی ساتھ رہتے ہیں، اس لیے اس کے لیے اصطلاح ''گوبر والا گھر'' بڑی مناسب ہے۔ یہاں پر یہ چھوٹے چھوٹے گھر برابر بنے ہوئے ہیں۔ جہاں مسافروں کو فروخت کے لیے پرندے، بکریاں اور بھیڑیں پالی جاتی ہیں، اس مقصد کے لیے جو مکانات تعمیر کیے گئے ہیں وہ لاہری بندر اور ٹھٹھہ کے درمیان راستے میں دیکھے جا

سکتے ہیں۔

میرے ٹھٹھہ پہنچنے سے اور راستے میں جو لٹیروں سے لڑائی ہوئی اس سے پہلے ہی میری سنگانی بحری قزاقوں پر فتح جو کہ میں نے مالا بار اور لاہری بندر کے درمیان سمندری سفر کے دوران کی تھی' وہاں لوگوں میں مشہور ہو چکی تھی۔ لہٰذا شہر میں میرا بڑا پر تپاک استقبال ہوا۔ شہر کے شرفاء میری ملاقات کے آئے تو اپنے ہمراہ مٹھائی اور پھلوں کے تحفے لائے۔ کیونکہ ہمارا قافلہ راستے کے خطروں سے گزرتا ہوا حفاظت کے ساتھ پہنچ گیا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں قافلے کی شجاعت و بہادری کی بھی تعریف کی۔

یہاں پر ہم پندرہ کمروں پر مشتمل ایک آرام دہ مکان میں رہائش پذیر ہوئے۔ اس میں اشیاء کے رکھنے کے لیے عمدہ گودام بھی تھے۔ دوسرے دن نواب کی جانب سے تحفہ میں ایک بیل' پانچ بھیڑیں' بہت سی بکریاں' بیس پرندے اور پچاس کبوتر آئے۔ اس کے ساتھ بڑی تعداد میں مٹھائی اور پھل تھے۔ اس وقت وہ شہر سے 6 میل کے فاصلہ میں کیمپ میں تھا' جہاں 8 یا 10 ہزار فوجی تھے' اس کا ارادہ تھا کہ ان بلوچیوں اور مکرانیوں کو سزا دے کہ جنہوں نے جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں قافلے کو لوٹا تھا اور اس کے لوگوں کو قتل کیا تھا۔ اس نے ہم سے دریافت کیا کہ ہمارے لیے کونسا وقت سہولت کا ہوگا کہ ہم اس کے ساتھ کافی کا ایک کپ پی سکیں۔ ہمارے لانے کے لیے وہ گھوڑے روانہ کر دے گا۔ میں نے اس کی مہربانی پر شکریہ ادا کیا اور خواہش ظاہر کی کہ دوسرے دن میں اس کی دست بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ اس نے دوسرے دن 20 خوبصورت اور چاق و چوبند اور تمام آلات سے آراستہ ایرانی گھوڑے ہماری سواری کے لیے بھیج دیئے۔ ان میں 10 میں نے اپنے لیے منتخب کر لیے تاکہ میں اور میرا حفاظتی دستہ ان پر سواری کرے۔ دس ان شریف تاجروں کو سواری کے لیے دیئے جو کہ میرے ساتھ بطور دوستی جانا چاہتے تھے۔ جیسے ہی ہم کیمپ کے قریب پہنچے تو بطور احترام کے ہم گھوڑوں سے اتر آئے' لیکن ایک گھڑ سوار عہدیدار جو ہمارے استقبال کو آیا تھا' اس نے ہمیں روکا اور کہا کہ نواب کی یہ خواہش ہے کہ ہم اس کے خیمہ تک سوار ہو کر آئیں۔ چنانچہ وہ راہنمائی کرتا ہوا ہمیں خیمہ کے دروازے تک لایا۔ جیسے ہی ہم گھوڑوں سے اترے' مجھے نواب کے خلوت کدے میں پہنچایا گیا کہ جہاں اس وقت وہ اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ہمراہ جو لوگ آئے تھے انہیں ایک گھنٹہ تک اندر نہیں آنے دیا گیا باہمی ادب آداب اور

حال چال پوچھنے میں کافی وقت لگا۔ چونکہ مجھے ادب آداب اور رسومات کا پتہ تھا اور یہ معلوم تھا کہ کسی اہم عہدیدار یا امیر کے سامنے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے' اس لیے میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس کے قدموں میں ایک معمولی تحفہ رکھ سکوں۔ جس کی اس نے اجازت دے دی' تحفے میں ایک آئینہ تھا جس کی قیمت 5 پونڈ تھی' ایک بندوق اور پستولوں کی ایک جوڑی جس کے دستوں پر سونے کا کام ہوا ہوا تھا' ایک تلوار' مزین دستہ والا خنجر اور اس کے تمباکو پینے کے لیے شیشہ سے بنا حقہ معہ اسٹینڈ کے۔ اس کے بعد اس نے میرے ساتھیوں کو خیمہ میں بلایا اور ان تحفوں کو دکھایا جو میں نے اس کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ اس نے ہر تحفہ کی مبالغہ آمیز حد تک تعریف کی' ساتھ ہی میں میری بہادری اور فیاضی کو سراہا اور کہا کہ میں ٹھٹھہ کا آزاد شہری ہوں' ساتھ اس نے یہ اعلان کر دیا کہ میرے سامان تجارت پر کوئی کسٹم ڈیوٹی نہیں لگے' اگر کسی نے سامان کو خریدا اور اس کے عوض رقم ادا نہیں کی' تو میرے لیے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ قاضی کی عدالت میں انصاف کے لیے جاؤں بلکہ یہ اختیار ہوگا کہ قرض یا رقم نہ دینے والوں کو قید کر سکتا ہوں۔ اگر اس سے بھی وہ میری رقم دینے پر تیار نہ ہوں تو میں ایسے لوگوں کی جائیداد بیویوں' بچوں اور ان کے قریبی رشتہ داروں کو فروخت کر سکتا ہوں تاکہ اس ذریعہ سے اپنی رقم وصول کر سکوں اس رعایت کی وجہ سے مجھے ہمیشہ اس وقت سہولت ہوئی کہ جب بھی رقم کی وصولی کے سلسلہ میں شرائط طے کی جاتی تھیں۔ تین گھنٹے کی گفتگو کے بعد ہم رخصت ہوئے۔ رخصت کرتے وقت اس نے کہا کہ جیسے ہی اس کی یہ مہم ختم ہوگی وہ میرے گھر پر آ کر دوبارہ مجھ سے ملاقات کرے گا۔ لیکن ان تین مہینوں میں کہ جب میں ٹھٹھہ میں رہا' وہ شہر واپس نہیں آیا لیکن اس دوران وہ برابر میری صحت اور میرے حالات کے بارے میں پوچھتا رہا۔

اس گوبر والے گھر سے جب ٹھٹھہ کی جانب جایا جائے' تو شہر سے 4 میل کے فاصلے پر ابھرتے ہوئے میدان میں 40 مقبرے ہیں جن کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی چھوٹا شہر ہے۔ یہ سندھ کے ان بادشاہوں کا قبرستان ہے کہ جب سندھ پر ان کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ میں ان میں سے سب سے بڑے مقبرے میں گیا کہ جس کے اوپر گنبد ہے اور درمیان میں قبر یا تعویز ہے جو تین فٹ اونچا اور سات فٹ لمبا ہے۔ یہاں اور قبریں بھی تھیں مگر سائز میں کم تھیں۔ گنبدوں کے رنگ پیلے سرخ' اور سبز ہیں جو کہ دور سے چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان میں استعمال ہونے والے

پتھر چوکور خانوں کی شکل میں ترتیب سے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی رنگ برنگی شکل دیکھ کر آنکھیں حیران رہ جاتی ہیں۔ اور انہیں خاص قسم کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مقبرے تقریباً 10 گز اونچے اور 7 گز اطراف میں ہوں گے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ اس ملک کے آخری بادشاہ کا مقبرہ ہے کہ جس کے ملک پر جہاں گیر نے جو کہ مشہور بادشاہ اورنگ زیب کا دادا تھا اس نے قبضہ کیا تھا۔ یہ سترہویں صدی کا ابتدائی زمانہ ہے کہ جب اس نے سندھ کے بادشاہ کو شکست دے کر قیدی بنایا اور اس سے پوچھا کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے کیا چاہتا ہے' وہ جو مانگے گا اسے پورا کیا جائے گا۔ اس نے شریفانہ انداز میں جواب دیا کہ وہ چاہتا ہے وہ اس کی ملکہ اور اس کی اولاد اس مقبرے میں دفن ہوں جو اس نے اپنے عہد کی خوش حالی میں تعمیر کرایا تھا' اس پر اس کے اس وقت دو لاکھ روپیہ خرچ ہوئے تھے۔ یہ وہ درخواست تھی کہ جو اس کا فاتح رد نہیں کر سکا۔

ٹھٹھہ کا شہر دریائے سندھ سے دو میل کے فاصلہ پر ایک کھلے میدان میں واقع ہے۔ دریا سے نہر کو کاٹ کر یہاں لایا گیا ہے تاکہ شہر کو پانی کی سپلائی ہو سکے' اور اس سے شہر کے باغوں کو سرسبز رکھا جا سکے۔ 1699ء تک شہر میں بادشاہ کے باغات بڑی اچھی حالت میں تھے کہ جن میں پھلوں اور میوں کے بے شمار درخت تھے خاص طور سے انار بے انتہا لذیذ ہوتے ہیں۔ میں نے زندگی میں اس جیسا لذیذ انار پھر کبھی نہیں کھایا۔

میرے آنے سے تین سال پہلے بارش نہ ہونے کی وجہ سے شہر اور اس سے ملا ہوا علاقہ ویران ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شہر میں تقریباً 8 ہزار یا اس سے زیادہ لوگ مر گئے تھے' یہ وہ شہر تھا کہ جہاں سلک اور روئی سے کپڑے تیار ہوتے تھے' یہ کاروبار بھی ختم ہو گیا تھا۔ آدھا شہر تباہ ہو گیا تھا اور آبادی سے خالی تھا۔ یہ وجہ تھی کہ نواب شہر سے باہر کیمپ لگائے ہوئے تھا کہ جہاں میں اس سے ملنے گیا تھا۔ کیمپ کو چوکور انداز میں لگایا تھا' اس کے اردگرد ایک خندق کھدی ہوئی تھی جو کہ تین گز چوڑائی میں تھی اور گز گہری تھی۔ خندق کے بعد جو کھلا میدان تھا وہاں 4 فٹ اونچی فصیل بنا دی گئی تھی۔ اس کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازے سے سیدھی سڑک اس کے بالمقابل دروازے تک جاتی تھی' جس کی وجہ سے صلیب کی شکل بن جاتی تھی۔ نواب کا محل اس صلیب کے بیچ میں واقع تھا۔ خندق کو دریائے سندھ کے پانی سے بھر دیا جاتا تھا اور جب ضرورت ہوتی تھی' اسے خشک بھی کر دیا جا[illegible]ن پانی کو کیمپ سے دو میل کے فاصلہ پر ایک دلدلی علاقہ میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔

دریائے سندھ کشمیر تک جہاز رانی کے قابل ہے' اس کی ایک شاخ کابل تک جاتی ہے' جب کہ دوسری شاخیں پنجاب' لاہور' ملتان اور بکھر کو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ تمام شہر جو اس کے ساتھ ساتھ واقع ہیں وہ اس اندرون ملک کی جہاز رانی سے مستفید ہوتے ہیں ان کے جہاز کفتیز (Kifties) کہلاتے ہیں اور ہر سائز کے ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا 200 ٹن وزن اٹھا سکتا ہے۔ ان کی زیر سطح ہموار ہوتی ہے' اس کی دونوں جانب اگلے حصہ سے آخر تک کیبن بنے ہوتے ہیں۔ ہر کیبن میں ایک باورچی خانہ ہوتا ہے اور ٹائلٹ کی جگہ جہاں سے کہ گندگی سیدھی پانی میں جا گرتی ہے۔ یہ کیبنز مسافروں کو کرایہ پر دی جاتی ہیں۔ تا کہ وہ اپنے سامان ضروریات کے تحت علیحدہ رہ سکیں۔ ہر مسافر اپنی کیبن کو بغرض حفاظت تالہ بند رکھ سکتا ہے۔ اس طرح اس کا سامان تجارت ہر اس جگہ فروخت کے لیے تیار رہتا ہے جہاں کہ منڈی میں مانگ ہوتی ہے۔ میں نے اب تک اپنی زندگی میں سفر کی اس سے زیادہ دریا یا سمندر میں سہولتیں اور کہیں نہیں دیکھیں۔ کشتیوں اور جہازوں پر بڑے سائز کا مستول ہوتا ہے' اس کو اس وقت استعمال کیا جاتا ہے کہ جب سخت ہوائیں چلتی ہیں' لیکن جب ہوا بند ہو تو ان کو کھولا نہیں جاتا ہے۔ ان کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جہاز میں کافی تعداد میں لوگ ہوں تا کہ اس وقت جب کہ ہوا مخالف ہو تو وہ لہروں کے خلاف چل سکیں۔ لہٰذا ٹھٹھہ سے لاہور کا سفر 6 سے 7 ہفتوں میں طے ہوتا ہے' لیکن لاہور سے واپسی میں کوئی 18 دن لگتے ہیں' اور کبھی کبھی یہ سفر بارہ دن میں بھی ہو جاتا ہے۔

ٹھٹھہ کے قریب دریا کی چوڑائی تقریباً ایک میل ہوگی۔ جب میں نے سیسہ کو رسی کے ذریعہ پانی میں ڈال کر اس گہرائی کو جانچا تو یہ چھ فیتھم (Fatham) گہرائی تھی (ایک فیتھم میں چھ فٹ ہوتے تھے) لہریں کوئی زیادہ تیز نہیں تھیں۔ اس لیے اس کی رفتار ایک گھنٹہ میں دو یا ڈھائی میل کی تھی۔ دریا میں مچھلیوں کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔ ان میں سے مچھلی کی ایک قسم تھی کہ جو اس قدر لذیذ تھی کہ ایسی مچھلی میں نے اب تک نہیں کھائی تھی (شاید یہ پلا مچھلی ہو) ان میں سے کچھ مچھلیوں کا وزن 20 پاؤنڈ سے زیادہ تھا۔ ہم ان میں سے کچھ کو زندہ ٹھٹھہ کی مارکیٹ کے لیے لے کر آئے۔ ان کے ہاں کالے رنگ کے مویشی بہت ہیں۔ بہت صحت مند بکریاں اور بھیڑیں جن سے کہ 80 سے 100 پونڈ تک گوشت مل جاتا ہے۔ ان کے گھوڑے چھوٹے ہوتے ہیں' مگر محنتی اور سخت جان اور تیز رفتار۔

ہرن، خرگوش اور لومڑیاں جنگل میں شکار کے لیے بہتات سے ہیں۔ ان کا شکار وہ کتوں، چیتوں اور ایک خطرناک قسم کی مخلوق سے کرتے ہیں۔ یہ سائز میں لومڑی کے برابر ہوتی ہے۔ اور اس کے کان لمبے خرگوش کی طرح ہوتے ہیں، منہ اس کا بلی کی مانند ہوتا ہے۔ اس کی پیٹھ اور اطراف کالے جب کہ اس کا پیٹ اور سینہ سفید ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ یہ کوئی بہت ہی نایاب قسم کا جانور ہے کیونکہ میں نے اسے تعداد میں ایک سے زیادہ نہیں دیکھا۔ جب انہیں شکار کے لیے لیجایا جاتا ہے تو گھڑ سوار اسے پیچھے بٹھالیتا ہے، اس کی آنکھوں پر پٹی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ہرن انسانوں سے بہت انسیت رکھتے ہیں، اس لیے وہ اس وقت تک نہیں بھاگتے جب تک کہ گھوڑے بالکل قریب نہیں آ جائیں۔ وہ سوار کہ جو اس شکاری جانور (Shogoose) کو لیے ہوئے ہوتا ہے وہ اس کی آنکھوں سے پٹی اتارتا ہے اور شکار کو دکھاتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی وہ گھوڑے سے چھلانگ لگا کر تیزی سے بھاگتے ہوئے ہرن کی پیٹھ پر حملہ کرتا ہے اور اپنے شکار کی آنکھیں کھرچ کر باہر نکال دیتا ہے تا کہ شکاری اسے آسانی سے شکار کر سکے۔ چیتے اپنے شکار کو بھگا بھگا کر تھکا دیتا ہے، یہی کام کتے بھی کرتے ہیں، مزید یہ کہ اگر شکار پانی میں گر جاتا ہے تو وہ تیرتا ہوا جاتا ہے اور وہاں سے اسے اٹھالاتا ہے۔ ان کے پاس بڑی تعداد میں مور، کبوتر، فاختائیں بطخیں ان کی مختلف اقسام جیسے (Teal) جنگلی بطخ (widgeon) جنگلی ہنس، ایک قسم کی لمبی چونچ والی مرغابی (Curlew) تیتر اور پلوور (Plovers) ہر ایک کو آزادی ہے کہ وہ جس قدر چاہے ان کا شکار کر سکتا ہے۔ وہ اپنے باغوں اور کھیتوں میں ایک خاص قسم کا پھل بوتے ہیں جو سلاب (Salab) کہلاتا ہے، یہ سائز میں شفتالو کے برابر ہوتا ہے، لیکن اس میں کوئی بیج نہیں ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے پہلے وہ اسے خشک کر لیتے ہیں اور اسے پوڈر کر کے اسے چائے یا کافی کی طرح شکر کے ساتھ پیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے استعمال سے ذہنی تناؤ کم ہو جاتا ہے اور انسان چاق و چوبند رہتا ہے۔

اس ملک میں اناج، چاول، دالوں اور گھوڑوں و مویشیوں کے چارے کی بہتات ہے۔ انہیں قحط کی تکالیف و اذیت کا احساس نہیں ہے۔ اپریل، مئی اور جون کے مہینوں میں دریائے سندھ کا پانی نشیبی علاقوں میں آ جاتا ہے، جب یہ سیلاب ختم ہوتا ہے تو اپنے پیچھے زمین پر مٹی کی تہہ چھوڑ جاتا ہے، یہ اس کے خشک ہونے سے پہلے اس میں بیج ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہر فصل خوب عمدہ ہوتی ہے۔

اس ملک کی دوسری پیداوار میں شورہ، بوریکس (Boret) نیلا رنگ کی معدنی شئے

(Lapis Lasuli) قابل ذکر ہیں خام سلک اچھی کوالٹی کی نہیں ہوتی ہے جو سلک یہاں بنائی جاتی ہے اسے یہ ''جامہ وار'' کہتے ہیں۔ جو کپڑا سلک اور روئی کے ملانے سے بنتا ہے وہ کوٹے نی (Cuttenees) کہلاتا ہے' سلک اور ان کی ملاوٹ والا کلبلے (Culbulays) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ جو کپڑا بناتے ہیں اسے جوڑی (jurries) کہتے ہیں۔ یہ بہت نفیس اور ملائم ہوتا ہے' ساتھ ہی قیمتاً سستا بھی۔ بستر کی چادریں بھی دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ یہ خوبصورت فرنیچر بناتے ہیں کہ جس پر ہاتھی دانت سے مرصع کاری کی جاتی ہے۔ دنیا کے بہترین تیر کمان بھینیس کے سینگوں سے ملتان میں تیار ہوتے ہیں۔ اگر وہ میزوں اور دوسرے فرنیچر میں خوبصورتی کے لیے بھراؤ کرتے ہیں مگر اس میں چین ان سے آگے ہے۔ یہ مکھن سے بنے گھی کو کپیوں میں بند کر کے بڑی تعداد میں باہر کی منڈیوں میں بھیجتے ہیں۔ جب اس گھی میں نمک ملا دیا جاتا ہے تو یہ پورے سال تازہ رہتا ہے' لیکن جب یہ پرانا ہو جاتا ہے تو خراب ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک خاص قسم کی لکڑی ہوتی ہے' بلکہ اسے لکڑی سے زیادہ جڑ کہا جائے تو بہتر ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اب کہیں نہیں پڑھا' لیکن یہ خوشبو کا ایک اہم عنصر ہے۔ یہاں پر یہ بڑی تعداد میں پیدا ہوتی ہے اور اسے سورت میں برآمد کیا جاتا ہے' یہاں سے یہ چین کو بھیجی جاتی ہے کہ جہاں یہ مہنگے داموں فروخت ہوتی ہے۔ اسے کوٹ کر اس کا پاؤڈر بنا لیا جاتا ہے اور تمام بت پرست انگیٹھیوں میں رکھ کر بتوں کے سامنے اس کی خوشبو کو پھیلاتے اور عبادت کرتے ہیں۔

یہاں کا قانونی مذہب اسلام ہے' لیکن ایک مسلمان کے مقابلہ میں 10 غیر مسلم ہیں لیکن ٹھٹھہ کا شہر مسلم ادب کی تعلیم میں مشہور ہے یہاں الہیات' فلسفہ اور سیاست کے علوم پڑھائے جاتے ہیں' اس مقصد کے لیے تقریباً چار سو سے زیادہ تعلیمی ادارے ہیں کہ جہاں نوجوان طالب علم فیض یاب ہوتے ہیں۔ میری الہیات کے ایک پروفیسر سے دوستی ہو گئی یہ خود کو اچھا مورخ بھی سمجھتا ہے۔ ایک دن اس نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا میں اپنے ملک کے سکندر اعظم کو جانتا ہوں۔ میں نے کہا یقیناً اور پھر اسے اس جنگ کے بارے میں بتایا کہ جو پورس سے ہوئی تھی' اور جس میں وہ فتح یاب ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ ان کی تاریخ کی کتابوں میں سکندر اور پورس کا واقعہ درج ہے۔ مگر مختلف انداز میں ہے اور دونوں بادشاہوں کے ناموں میں بھی فرق ہے' اور اس میں بھی کہ سکندر نے دریائے سندھ کیسے پار کیا۔ اس نے کہا کہ ان کی کتابوں میں الکزنڈر کے بجائے سکندر ہے اور

یہ سکندر ایک بڑا جادوگر تھا' اس نے ہزاروں جنگلی ہنسوں کو بلایا کہ جنہوں نے اس کی فوج کو دریا پار کرایا۔ پورس کے ہاتھیوں نے جادو کی وجہ سے اس کی فوج کی طرف رخ نہیں کیا۔

یہاں پر سابق میں پرتگیزیوں نے ایک چرچ تعمیر کیا تھا جو کہ شہر کے مشرقی حصہ میں تھا۔ یہ مکان ابھی تک باقی ہے اس میں عیسائی اولیا کی تصاویر اور قربان گاہ کی چادر بھی ہے جو یہ مجھے فروخت کرنا چاہتے تھے' مگر میں ان چیزوں کا تاجر نہیں ہوں۔

غیر مسلم اپنے مذہبی عقائد میں بالکل آزاد ہیں۔ یہ اپنے روزے اور تہوار اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ پرانے وقتوں میں ان کا دستور تھا جب کہ ان کے اپنے بادشاہوں کی حکومت تھی۔ یہ اپنے مردے جلاتے ہیں' لیکن عورتوں کو اپنے شوہروں کے ساتھ جلنے سے روکا جاتا ہے۔ یہاں ہاتھی دانت کی بڑی مانگ ہے' کیونکہ اس کی بنی چوڑیاں عورتیں پورے بازوں پر پہنتی ہیں' یعنی کہنی سے لے کر پہنچے تک۔ ان کے مرنے پر یہ تمام چوڑیاں ان کے ساتھ جلا دی جاتی ہیں۔

جس زمانہ میں میں وہاں تھا' میں نے ان کے کئی تہوار دیکھے' ان میں سے ایک فروری میں چاند نکلنے پر ہوتا ہے' اسے یہ ہولی کا تہوار کہتے ہیں اور اس موقع پر یہ مسخرانہ حرکات کرتے ہیں۔ تمام عورتیں اور مرد گلیوں میں نکل آتے ہیں۔ اور ڈھول تاشے بجاتے ہیں۔ عورتیں مٹھائی کی ٹوکریاں سر پر رکھے ہر شخص کو مٹھائی کھلاتی ہیں۔ مرد ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے ہیں اور ایک دوسرے پر احتیاط سے تیل ملتے ہیں۔ جب وہ کسی کے گھر میں جاتے ہیں تو وہاں بھی تیل چھڑکتے ہیں کہ جس کی بو اچھی نہیں ہوتی ہے لیکن وہ گھروں سے باہر لوگوں پر عرق گلاب چھڑکتے ہیں اور چاندی کے سکے خیرات کرتے ہیں۔

دریائے سندھ کو یہاں سے دیکھنا مشکل ہوتا ہے' مگر ایک ولی اللہ کے لیے جو مقبرہ بنایا گیا اس میں ایک مینار تعمیر کر دیا ہے جو ''سندھی مینار'' کہلاتا ہے۔ اس پر سفید قلعی ہے تاکہ یہ ہمیشہ دور سے نظر آتا رہے' یہاں سے ایک نہر جو دریا تک جاتی ہے وہ بہت تنگ ہے اور ڈھائی فیتھم سے اونچی نہیں ہے' لیکن دریائے سندھ کی یہ چھوٹی شاخ ہے جس سے شہر کو پانی ملتا ہے اسے ''دیولی'' یا ''سات مہنبہ'' والی کہا جاتا ہے یہ دوسری نہروں کی طرح سمندر میں جا کر گر جاتی ہے۔

❁

علاقائی تعلق سے سندھ کی معیشت اور معاشرہ
(1750-1950)

یہ مضمون کلارڈ مارکووٹس (Clarde Markovits) کی کتاب ''ہندوستانی تاجروں کی گلوبل دنیا 1947-1750 سندھ کے تاجر بخارا سے پناناما تک'' ہے۔ The Global World of Indian Merchants, 1750-1947: Traders of Sind from Bukhara to Panama. Cambracdge 2000. کے دوسرے باب کا ترجمہ ہے۔ کلارڈ مارکووٹس نیشنل سینٹر آف سائنٹیفک ریسرچ پیرس کے ڈائریکٹر ہیں۔

جنوب ایشیا کی تاریخ میں سندھ ایک فراموش شدہ اور نظرانداز کیا ہوا علاقہ ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سرحدی پر واقع ہے۔ ہندوستان اور خراساں کے درمیان ہونے کی وجہ سے یہ ان کو دونوں علاقے کو ملانے کا کام کرتا تھا۔ خراساں میں جنوبی افغانستان' بلوچستان' اور جنوب مشرقی ایران شامل تھے جہاں ایرانی کلچر کا زبردست اثر تھا' سندھ وقتاً فوقتاً شمال ہندوستان میں قائم ہونے والی سلطنتوں کے تابع بھی رہا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں کلہوڑہ اور ٹالپر حکمراں خاندانوں کے عہد میں اس نے مقامی سیاسی نظام کی تشکیل کی' جسے قبائلی کنفیڈریشن کہا جاسکتا ہے جو کہ اس قابل تھی کہ ایشیا کے سب سے بڑے نہری نظام کو زیریں سندھ میں نہ صرف ترقی دے

سکے بلکہ اس کو برقرار بھی رکھ سکے۔ سندھ پر حکومت برطانیہ نے قبضہ کرنے سے پہلے سندھ کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم چلائی اور اسے بدنام کیا اور یہ کہا گیا کہ یہ ایک پس ماندہ ریاست تھی کہ جس کے حکمراں جابر و ظالم تھے۔ لیکن تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں تھا۔ (1) اس سلسلہ میں خصوصیت سے نیپیر اور اس کے ہمنواؤں نے سندھ کے ہندوؤں اور ان پر ہونے والے مظالم کا بڑا تذکرہ کیا ہے تاکہ اس کو وہ اپنے حملہ اور سندھ پر قبضہ کا جواز پیش کرسکیں' اگرچہ بعد میں نیپیر نے خود اس قبضہ کو "بدمعاشی کا ایک قدم" کہا تھا۔ (2) اس لیے ہندوؤں کا نوآبادیات سے پہلے اور بعد میں سندھ کی تاریخ میں کیا کردار رہا ہے' یہ انتہائی اہم سوال ہے کیونکہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی سندھ کی تاریخ واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔

سندھ کی تجارت: 1750 سے پہلے کا پس منظر

سندھ برصغیر کا ساحلی علاقہ ہے' خلیج فارس کے قریب ہونے کی وجہ سے ابتدا ہی سے یہ اس سے تجارتی تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے وسط ایشیا اور برصغیر کو بھی تجارتی طور پر ملانے کا کام کیا۔ اس طرح خشکی اور سمندری دونوں راستے اس کی تجارتی اہمیت کو متعین کرتے تھے۔ (3) یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہڑپہ کے تہذیبی دور میں موہنجوداڑو اور میسوپوٹامیہ کے درمیان تجارتی تعلقات تھے' لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ آٹھویں صدی میں عربوں کی سندھ کی فتح کی وجہ بھی تجارتی تھی۔ (4) عربوں کی فتح کی ایک وجہ انڈس ڈیلٹا میں واقع بندرگاہ یا بندرگاہوں پر قبضہ کرنا تھا۔ دیبل کی بندرگاہ پانچویں صدی عیسوی میں اہمیت کی حامل ہوئی' جب اس پر ایران کے ساسانیوں کا قبضہ تھا اور 632 (5) میں یہاں پر عربوں کے جہاز پہلی مرتبہ آئے۔ 711ء میں محمد بن قاسم کا قبضہ عرب فتح کی ابتداء تھی۔ اس وقت کے سندھ کے بارے میں ایک مصنف کی رائے تھی کہ بحر ہند کی تجارت کا انحصار سندھ پر ہے۔ اس کے خشکی کے راستے تجارتی قافلوں کی راہ گزر ہیں۔ (6) عربوں کی فتح کے بعد سندھ اسلامی امپائر کا ایک حصہ بن گیا اور خلیج فارس و مشرق وسطی سے اس کی تجارتی سرگرمیاں اور زیادہ بڑھ گئیں۔ دیبل کی بندرگاہ بارہویں صدی تک انتہائی اہم رہی۔ (7) جب دیبل کی بندرگاہ کا زوال ہوا تو متوازی طور پر لاہری بندر کا قیام عمل میں آیا۔ جو ٹھٹھہ کے شہر کی تجارتی و کاروباری مرکز ہونے کی وجہ سے اہمیت اختیار کرگئی 1330 کی دہائی میں ابن بطوطہ نے

اس بندرگاہ کی سیر کی تھی۔(8) ہمیں ان لوگوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں کہ جوان دنوں تجارت میں مصروف تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اس عہد میں عرب تاجر اور سندھ کے تاجر دو علیحدہ گروپوں میں تقسیم تھے۔(9) یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا پندرہویں صدی سے پہلے بھی ہندو تاجران سرگرمیوں میں شامل تھے؟

سندھ کے بنیوں کے بارے میں پہلا ذکر عرب اور پرتگیزی دستاویزات میں ہے کہ جن کا تعلق مسقط سے تھا۔ یہ ذکر پندرہویں صدی کے اواخر میں آیا ہے۔ ٹھٹھہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ''مسقط کا سب اہم ساتھی ہے اور مزید کہا ہے کہ ہندو بھاٹیہ سندھ اور عرب کے درمیان تجارت کرنے والے لوگ ہیں۔''(10) یہ لوگ پرتگیزی جہاز استعمال کرتے تھے اور ان کے مسقط میں تجارتی گودام تھے۔ جب پرتگزیوں نے ہرمز کی بندرگاہ پر قبضہ کرلیا' تو ان کی دستاویزات کے مطابق سندھ سے تجارت کے نتیجہ میں دس فیصد کسٹم ریونیو حاصل ہوتا تھا۔ ڈیگو دا کوٹوا (Diego de Couta) کے مطابق ٹھٹھہ کا شہر مشرق کے امیر ترین شہروں میں سے ایک تھا۔(11) ٹھٹھہ کی خوش حالی کی ایک وجہ تو اس کی کپڑے کی صنعت تھی' جو کہ اعلیٰ کوالٹی کی تھی' اس میں کاٹن کے کپڑوں کی مختلف قسمیں تھیں جن میں سادہ کپڑ' بافتہ' چھینٹ اور سلک کا بنا ہوا اعلیٰ قسم کا کپڑا قابل ذکر تھیں۔(12) ٹھٹھہ میں پنجاب اور شمالی ہندوستان سے تجارتی قافلے دریائی راستوں کے ذریعہ اپنا مال لاتے تھے۔ سولہویں صدی میں جب کہ زیریں سندھ مغل سلطنت کا ایک حصہ بنا ہے تو اس کے بعد سے ٹھٹھہ کی خوش حالی میں کمی آ گئی تھی کیونکہ اب خلیج فارس کی تجارت دوسری مغل بندرگاہوں سے ہونے لگی تھی۔ 1640ء کی دہائی میں ٹھٹھہ کو ایک بار پھر تھوڑے وقت کے لیے اہمیت ملی کہ جب یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پرتگالیوں کو نکال دیا سترہویں صدی کے اوائل میں لاہری بندر مٹی کے جمع ہونے کی وجہ سے استعمال کے قابل نہیں رہا' اس نے ٹھٹھہ اور بندرگاہ دونوں کو زوال پذیر کر دیا۔ اگرچہ مغلوں نے ایک اور بندرگاہ ''اورنگ بندر'' کو ترقی دینے کی کوشش کی مگر تجارت شاہ بندر اور کھڑک بندر کی جانب منتقل ہوگئی' لیکن یہ دونوں خوش حالی کی اس اسٹیج تک نہیں پہنچ سکیں کہ جو ٹھٹھہ کو حاصل ہوئی تھی۔ یہاں پر کچھ ایسے شواہد ملتے ہیں کہ سترہویں صدی میں جبکہ سمندری تجارت زوال کی حالت تھی تو اس زمانے میں مقامی سندھی بنئے تجارت میں آگے بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے پرتگیزی جہازوں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے جہازوں

میں سامان تجارت بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ الکزنڈر ہملٹن جو 1699ء میں سندھ آیا تھا اس نے لکھا ہے کہ یہاں پر تجارت ہندو تاجروں کے ہاتھ میں ہے۔(13) اگرچہ ٹھٹھہ کا زوال شروع ہو چکا تھا' لیکن اس کے بھاٹیہ تاجر اس وقت بھی مسقط میں تجارت میں مصروف تھے جہاں انہوں نے شہر میں پہلا مندر تعمیر کیا تھا۔(14) ایسے شواہد ہیں کہ انہوں نے اپنی تجارت کو خلیج کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیلا دیا تھا جیسے بحرین کے جزیروں میں۔ لیکن سندھ کے بھاٹیہ اکیلے نہیں تھے جو تجارت میں مشغول تھے سیٹھ ناؤمل نے جو انیسویں صدی میں کراچی کا اہم تاجر تھا اس نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ اس کے اجداد سیٹھ بھوجومل' اور اس کا خاندان جن کا تعلق سہون شہر سے تھا 1720 میں وہ کھڑک میں آ کر آباد ہوئے' یہاں انہوں نے اپنی تجارت کمپنی قائم کی۔ جس کے گماشتے مسقط میں تھے اور پھر ان کے نمائندے بوشہر' شیراز اور بحرین میں تھے۔(15) 1720ء کی دہائی میں جب کھڑک ہندو کا زوال ہوا' تو سیٹھ بھوجومل نے کراچی کی نئی بندرگاہ کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی تعمیر اور حفاظتی فصیلوں کے بننے کے بعد اس پر کلھوڑا حکمرانوں نے قبضہ کر لیا' لیکن جلدی انہوں نے اسے قلات کے خاں کے حوالے کر دیا' جو کہ اس وقت بلوچستان کا ایک اہم حکمراں تھا۔ اس طرح پاکستان کے اس بڑے شہر کی ابتداء ایک ہندو بنئے نے کی تھی۔ یہ اٹھارویں صدی کے اواخر کی بات ہے کہ اس بندرگاہ میں ٹالپر حکمرانوں نے دلچسپی لینی شروع کی۔

اٹھارویں صدی کے نصف تک سندھ سمندری دریائی اور خشکی کے راستوں کے ذریعہ شمالی ہندوستان اور خلیج فارس اور عرب ملکوں کو تجارتی طور پر ملانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے تاجروں کی خوشحالی کا دارومدار اس علاقہ کی اپنی پیداوار اور صنعت پر تھا۔ ٹھٹھہ اپنے بندرگاہ کے زوال کے بعد بھی کپڑے کی صنعت کی وجہ سے ممتاز شہر رہا سندھ کے تاجروں میں ہندو بنئے سب سے زیادہ کامیاب تاجر تھے۔ اگرچہ مسلمان بھی تجارت میں تھے' مگر بنیوں کو اس پیشہ میں شہرت تھی یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ ایک ایسے ملک میں کہ جہاں مسلمان حکمراں ہوں اور جہاں کی آبادی پندرہویں سے اٹھارویں صدیوں تک اکثریت میں مسلمان ہوگئی ہو' وہاں تجارت اور معیشت پر ہندوؤں کا تسلط ہو؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس پر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہمیں یہاں پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل اٹھارویں صدی سے پہلے کی سندھ کی سماجی اور معاشی تاریخ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں' اس لیے ہم اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں

دے سکتے۔ اس سلسلہ میں ایک مقبول عام نظریہ تو یہ ہے کہ چونکہ قرآن شریف میں سود کو حرام قرار دے دیا ہے' لیکن جیسا کہ ایم رابنسن نے دلیل دیتے ہوئے کہا کہ اس کے باوجود مسلمان سود کے کاروبارے میں ملوث رہے۔(16) دوسری صورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مسلمان ریاستوں میں ریونیو جمع کرنے اور مالیہ کے انتظامات میں غیر مسلم اہل کار رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ سیاسی طور پر کمزور اور عدم تحفظ کا شکار ہوتے تھے اور انہیں آسانی سے قابو میں رکھا جا سکتا تھا' سندھ میں مالی امور کے انتظام کے لیے ہندوؤں کی ایک خاص برادری کو یہ کام سونپا گیا تھا جو کہ عامل کہلاتے تھے۔ ان کی ابتداء سندھ میں مغل تسلط کے بعد ہوئی' انہوں نے یہاں بھی وہی کردار ادا کیا کہ جو شمالی ہندوستان میں کایستھوں نے مغل دربار میں کیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عاملوں کے عروج اور بنیوں کی ترقی دونوں متوازی طور پر ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔ ایک ایسے ماحول میں کہ جب عامل ریونیو کے انتظام میں مصروف تھے' بنئے تجارت میں آگے بڑھ رہے تھے۔

سندھ میں تجارت اور معاشرہ: 1750 سے 1843 ہندو بنیوں کا کردار

اٹھارویں صدی کے نصف میں سندھ کی تاریخ میں تبدیلی آئی' اگر اس سے پچھلے دور کے حالات کو دیکھا جائے تو تبدیلی کے ان رجحانات کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ یہ وہ اہم سیاسی تغیرات تھے کہ جنہوں نے تجارتی معاملات پر گہرا اثر ڈالا۔ پندرہویں صدی کے اواخر سے اٹھارویں صدی کے نصف تک زیریں سندھ اور اس کا شہر ٹھٹھہ اہم تجارتی مرکز تھا' جب کہ اس صدی کے آخر میں کراچی ایک متبادل بندرگاہ کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ اس دوران میں بالائی سندھ اور اس کے شہر پنجاب شمالی ہندوستان اور وسط ایشیا کے تجارتی قافلوں کو زیریں سندھ کی بندرگاہوں تک لاتے تھے۔ وسط ایشیا اور شمالی ہندوستان کی تجارت کا زیادہ حصہ بالائی سندھ کو نظر انداز کر دیتا تھا' کیونکہ ملتان اس وقت تجارتی قافلوں کے لیے تجارت اور معیشت کا بڑا مرکز تھا۔

لیکن اٹھارویں صدی کے نصف میں تجارت نے جنوب کی جانب رخ موڑ لیا' جس کی وجہ سے بالائی سندھ کو فائدہ ہوا۔ اس کی وجوہات سیاسی تھیں۔ دو اہم باتوں کی وجہ سے بالائی سندھ کی اہمیت بڑھ گئی۔ ان میں ایک وجہ تو ملتانی گروبندی کا زوال تھا' جس نے سترہویں صدی میں شمالی

ہندوستان اور روس اور وسط ایشیا کے درمیان تجارت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اسٹیفن ڈیل (Stephen Dale) نے ملتانی تجاروں کے زوال کا سبب روسی ریاست کے اس فیصلہ کو قرار دیا کہ جس نے ہندوستانی تاجروں کو روس کی اندرونی تجارت سے خارج کر دیا تھا' ساتھ ہی روس اور ایران کے درمیان تجارت کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔(17) اس کے علاوہ دوسرے سیاسی حالات اس سے زیادہ موثر ثابت ہوئے۔ مثلاً ان حالات کو جے گومنس (J. Gommenis) انڈو افغانی امپائر کا عروج کہتا ہے۔(18) پشتون قبیلہ جو خود کو درانی کہتا تھا' اس نے جو سلطنت قائم کی اس کا مرکز قندھار تھا۔ جس کی وجہ سے یہ شہر شمالی ہندوستان کے درمیان تجارت کا تعلق بن گیا۔ اس شمالی ہندوستان اور قندھار کے درمیان سب سے مختصر راستہ بلوچستان اور بولان کا درہ ہو گیا' یہ کوئٹہ کو بالائی سندھ سے ملاتا تھا اور آگے چل کر تھر کے ریگستان سے ہوتے جیسلمیر اور بیکانیر تک جاتا تھا۔ یہ راستہ کہ جواب تک نظر انداز تھا درانی سلطنت کے قیام کے بعد اچانک اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ اس کی وجہ سے بالائی سندھ میں واقع شکارپور نے ملتان کی اہمیت کو گھٹا کر تجارتی شہر کی اہمیت حاصل کر لی۔ اگرچہ اس سلسلہ میں بہت سے حالات کی حیثیت سربستہ رازوں کی ہے' لیکن بہرحال یہ واضح ہے کہ اٹھارویں صدی کے نصف میں شکارپور درانی سلطنت کا اہم مالی شہر بن کر ابھرا اور اس شہر کے وہ خاندان کے جو ہنڈی کا کاروبار کرتے تھے' وہ نہ صرف افغانستان' بلکہ ایران و وسط ایشیا تک اپنے کاروبار کو پھیلائے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ تجارت کا بھی مرکز تھا' مگر اس کی تجارتی اہمیت اس قدر نہ تھی' جس قدر کہ اس کی مالی حیثیت تھی یہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا کہ بالائی سندھ کے ایک شہر نے معاشی طور پر زیریں سندھ کے شہروں پر فوقیت حاصل کر کے انہیں ایک لحاظ سے پسماندہ کر دیا۔

اس دوران زیریں سندھ میں بھی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ٹھٹھہ کے زوال کے بعد کراچی کی بندرگاہ ابھر رہی تھی۔ حیدرآباد ایک اہم شہر کے طور پر منظر عام پر آ رہا تھا کہ جس نے آگے چل کر سیاست اور کاروبار میں موثر طور پر حصہ لیا۔ ٹھٹھہ کا شہر لاہری بندر کے بند ہونے کے بعد ویران ہو گیا تھا اور اپنی تجارتی اور اقتصادی حیثیت کھو بیٹھا تھا۔ اس کے نتیجہ میں اس کے بھاٹیہ تاجر کو جنہیں 1785ء کے بعد سے اپنے حریف کچھی بھاٹیہ تاجروں سے واسطہ پڑا' انہوں نے جلد ہی مسقط کی تجارت پر قبضہ کر کے' انہیں پیچھے دھکیل دیا۔(19) ٹھٹھہ اب صرف صنعت و حرفت کی پیداوار کا شہر

رہ گیا کہ جو صرف مقامی ضروریات کی اشیا پیدا کرتا تھا' بین الاقوامی تجارت سے اس کا رابطہ کٹ گیا۔ اگرچہ بھاٹیہ تاجر خلیج فارس میں اہم تجارتی برادری کی حیثیت سے باقی رہے اور بعد میں انہوں نے بحرین میں موتیوں کی تجارت کے فروغ میں حصہ لیا۔ لیکن 1750 کے بعد کراچی سندھ کی اہم بندرگاہ بن گیا۔ جب سندھ کے ٹالپر میروں نے اسے قلات کے خان سے واپس لیا ہے تو انہوں نے بندرگاہ کی ترقی میں دلچسپی لی۔ اس نئی بندرگاہ پر نہ صرف سندھ کے تاجر آئے' بلکہ کچھ اور کاٹھیاواڑ سے ہندو مسلم تاجروں کی برادریاں یہاں آ کر آباد ہونا شروع ہوئیں' جس سے اس شہر کو کاسموپولٹن درجہ دے دیا۔ ایک دوسرا شہر کو جو تیزی سے ترقی پذیر ہوا وہ حیدرآباد تھا۔ (20) جسے 1769ء میں کلھوڑا حکمراں نے نیرون کوٹ کے مقام پر آباد کیا تھا۔ یہ شہر پھلیلی نہر کے ساتھ ساتھ آباد ہوا۔ اگرچہ کلھوڑا اسے اپنا دارالسلطنت بنانا چاہتے تھے' مگر اس منصوبہ کو پورا کرنے والے ان کے ٹالپر مرید تھے کہ جنہوں نے 1782ء میں کلھوڑوں کو شکست دے کر اور ان کے دارالسلطنت خدا آباد کو کہ جو سہون کے قریب تھا' مسمار کر کے حیدرآباد کو اپنا مرکزی مقام منتخب کیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آخر وہ کون سی وجوہات تھیں کہ جن کی وجہ سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا' لیکن ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے نام نہاد افغان حکمراں کے درمیان کہ جنہیں وہ خراج دیتے تھے طویل فاصلہ رکھنا چاہتے ہوں گے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کراچی کی ابھرتی ہوئی بندرگاہ کے نزدیک اس کی قربت بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ اگرچہ حیدرآباد سیاسی اور فوجی سرگرمیوں کا مرکز تھا' لیکن یہاں دربار ہونے کی وجہ سے تاجر اور بنکرز صنعت کار اور ہنرمند اس سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ شہر ایک ایسے تجارتی راستہ پر واقعہ تھا کہ جہاں سے تجارتی قافلے تھر کے ریگستان سے ہوتے ہوئے' عمرکوٹ' باڑمیر سے ہو کر جودھپور تک پہنچتے تھے۔

اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے زیریں سندھ کے تجارتی نظام میں مکمل تبدیلی آ چکی تھی' اب تک جو کام ٹھٹھہ شہر کرتا تھا' اب اس کی جگہ کراچی نے لے لی تھی۔ اور حیدرآباد بھی اس میں اپنا حصہ بٹا رہا تھا۔ اس دوران شکارپور معیشت اور تجارت کا مرکز بن کر ابھر رہا تھا جس کی وجہ سے بلائی سندھ کی اہمیت بڑھ رہی تھی اس کا یہ ابھار افغانستان میں درانی سلطنت کا محتاج تھا اگرچہ شکارپور کے راستے وسط ایشیا تجارتی قافلے جاتے تھے اور اس کے حیدرآباد اور کراچی سے بھی تعلقات تھے' جو کہ بہت زیادہ قریبی نہیں تھے' لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اٹھارویں صدی کے

آخر میں سندھ ہندوستان اور وسط ایشیا خلیج فارس کے درمیان اہم تجارتی اور معاشی مرکز تھا۔
زیریں سندھ اور بالائی سندھ کے درمیان فرق موجود رہا۔ شکارپور 1824ء تک افغانستان کے زیر
نگین تھا' اس کے بعد ہی یہ ٹالپر حکمرانوں کے تسلط میں آیا۔

انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں جو ایک اہم تبدیلی سندھ کی تجارت میں آئی وہ یہ تھی
کہ یہ مالوہ کی افیم کے سلسلہ میں وسط ہند اور چین کے درمیان ایک رابطہ بن گیا۔ اگرچہ یہ اس
تجارت کا کوئی راستہ تو نہیں تھا' مگر یہ تبدیلی اس لیے آئی کہ افیم کی تجارت کے سلسلہ میں ایسٹ
انڈیا کمپنی اور مقامی ہندوستانی تاجروں میں تصادم ہوا' جس نے سندھ کے راستہ چین کے لیے افیم
کی تجارت کے راستے کھول دیئے۔ اگرچہ مالوہ افیم کی تجارت کے بارے میں پوری معلومات اب
تک دستیاب نہیں ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ مالوہ افیم کی تجارت 1770 سے 1870 تک
ہندوستان میں سرمایہ کی بڑھوتری میں اہم عنصر تھی۔ اور یہ کہ ہندوستان میں مختلف تجارتی جماعتوں
نے اس کے منافع سے خوب سرمایہ اکٹھا کیا۔ اس کے ثبوت میں یہاں کچھ اعداد و شمار دیئے جاتے
ہیں۔ ہمارا تعلق اس پوری داستان سے صرف اتنا ہے کہ جس میں 1820 کی دہائی سے 1830 کی
دہائی تک سندھ کی تجارت و معیشت اس سے اثر انداز ہوئی کہ یہ زمانہ 1843ء میں سندھ پر
برطانوی قبضہ سے پہلے کا ہے۔

یہ 1821ء کی بات ہے کہ برطانوی حکومت ہند کے نوٹس میں سندھ کے اس چکردار راستہ
کے بارے میں معلوم ہوا کہ جو مالوہ کی افیم کے لیے استعمال ہوتا تھا' لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ راستہ
پہلے ہی سے استعمال ہوتا ہو۔ یہ تجارت اس وقت سے شروع ہوئی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ فیصلہ
کیا کہ مالوہ کی تمام افیم خرید کر اس پر اجارہ داری قائم کی اور اس کی تجارت کے لیے صرف برطانوی
علاقوں اور ان کے راستوں کو مخصوص کر دیا۔ اس پر ہندوستان کے مقامی تاجروں نے برطانوی
پالیسی کی مخالفت میں افیم کی تجارت کے لیے سندھ کے راستے کو منتخب کر لیا۔ یہ راستہ جیسا کہ
سرکاری دستاویزات میں بیان کیا گیا ہے پالی (Pali) سے شروع ہوتا تھا جو کہ جودھپور کے راجہ کا
علاقہ تھا' یہاں پر مالوہ کی مختلف منڈیوں سے افیم خرید کر لائی جاتی تھی' جن میں کہ سب سے ممتاز
اجین کی منڈی تھی' یہاں سے اونٹوں پر لاد کر یہ تھر ریگستان پار کر کے جیسلمیر آتی تھی اور پھر عمر کوٹ
کے راستے وادی سندھ اور کراچی کی بندرگاہ پر۔ یہاں کشتیوں میں لاد کر اسے ہندوستان کے

پرتگیزی علاقہ کی بندرگاہ دماؤ لے جایا جاتا تھا اور پھر مکاؤ کی بندرگاہ پر چین کی منڈیوں کے لیے لے جائی جاتی تھی۔(21)

فروری 1822ء میں بمبئی کے ریونیو ڈیپارٹمنٹ نے اپنے ایک خط میں جو کہ فورٹ ولیم کے حکام اعلیٰ کو لکھا گیا تھا' اس میں اس احکامات کا ذکر کیا ہے کہ جو برطانوی عہدیداروں نے اس خفیہ تجارت کو روکنے کے سلسلہ میں کیے تھے' اوران اقدامات سے آگاہ کیا تھا کہ جن کے ذریعہ برطانوی علاقے اور اس کی حمایتی ریاستوں میں اس تجارت کو روکنے کی غرض سے کیے تھے تاکہ اس پر اس قدر سختی کی جائے اور اس کو اس قدر مشکل بنایا جائے کہ افیون کے ان تاجروں کے لیے یہ غیر منافع بخش ہو جائے۔ مزید کہا گیا ہے کہ اگر جیسلمیر اور پالی کے راستوں کو بند کر دیا جائے اور امیران سندھ کو مجبور کیا جائے کہ وہ سندھ کے علاقے سے افیون کی تجارت کی اجازت نہ دیں' خصوصیت سے کراچی کی بندرگاہ کو استعمال نہ کرنے دیں۔ لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی کیا گیا کہ کمپنی کی حکومت ایک ایسی حکومت سے کسی قسم کی حمایت یا مدد کی کے لیے کیا توقع کرسکتی ہے کہ جس کی پالیسی سے ہم متفق نہیں ہیں اور جس پر ہم شک کرتے ہیں۔ اس کے بعد آٹھ سالوں کے اندر تجارت میں اتار چڑھاؤ رہا۔(22) لیکن اس دوران میں برطانوی حکومت کی یہ کوشش کہ ان ریاستوں سے کہ جہاں جہاں سے یہ راستے گزرتے تھے' ان سے معاہدوں کے بعد اس تجارت کو روک دیں لیکن ان کی یہ کوشش مکمل طور سے ناکام ہوئیں۔

1830ء میں حکومت نے افیون کی تجارت پر پابندیوں کی اس پالیسی کو ترک کر دیا' اور اس بات کی کوشش کی کہ مالوہ افیم کی تجارت کو داماؤ کے بجائے ان راستوں کے ذریعہ کرے کہ جن سے بمبئی کو فائدہ ہو' لیکن اس میں بھی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ مالوہ کی افیم داماؤ اور کراچی کے ذریعہ 1838ء تک چین تک پہنچتی رہی۔ ایک برطانوی عہدیدار کی 1837ء کی رپورٹ کے مطابق کراچی کے ذریعہ ہونے والی تجارت برآمدی تجارت کا ایک بڑا حصہ تھی۔ تجارت کی اس اہمیت کے ساتھ ساتھ اس نے سندھ کو ہندوستانی تجارتی سسٹم سے ملا دیا کہ جو چین' جنوب مغربی ایشیا اور وسطی ہندوستان کے درمیان تھا۔ کیا یہی وجہ تو نہیں تھی کہ برطانیہ نے سندھ پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس طرح تجارت کے اس راستہ کو بند کر دیا جائے۔ اس موضوع پر حال ہی میں ایک مقالہ میں اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔(23) میں اس موضوع پر زیادہ تو نہیں کہوں گا' مگر اس کی جانب اشارہ

ضرور کروں گا کہ 1839ء میں جب برطانوی افواج نے کراچی پر قبضہ کیا ہے تو انہوں نے موثر طریقہ سے پالی سے کراچی کے راستہ کو بند کر دیا اور افیون کی تجارت بمبئی کے ذریعہ ہونے لگی۔ یہ وہ کام تھا کہ جس کی کامیابی کے لیے انہوں نے بیس سال تک کوشش کی تھی۔

مختلف دستاویزات کے شواہد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس تجارت میں بنئے براہ راست شریک نہیں تھے، نہ تو وہ مالوہ سے افیم کی خریداری کر رہے تھے اور نہ ہی اسے جہازوں کے ذریعے کراچی سے داماؤ بھجوا رہے تھے۔ اس کاروبار میں ایک طرف تو مالوہ کے ساہوکار جن کی اکثریت گجراتی اور مارواڑی تھے اور جو کہ مالوہ میں آباد ہو گئے تھے اور جن کے اس علاقہ کی مقامی ریاستوں سے گہرے روابط تھے، خاص طور سے گوالیار اور اندورے، یہ وہ علاقے تھے کہ جہاں افیم کی کاشت ہوتی تھی، دوسری طرف ان کے ساتھ پارسی اور گجراتی سیٹھ جن کا تعلق بمبئی، احمد آباد، سورت سے تھا اور کچھ پور بندر اور کچھ کی مقامی ریاستوں کے باشندے تھے، اس تجارت کے نتیجہ میں سندھ کے بنیوں کو جو منافع ہوا، اس کی تفصیل مختلف ماخذوں سے اکٹھی کی گئی ہے۔ ان بنیوں نے ایک طرح سے ''مڈل مین'' کا کردار ادا کرتے ہوئے قافلوں کی دیکھ بھال کی اور مختلف ٹیکسوں کی ادائیگی کرنے میں ان کی مدد کی۔ اگرچہ تجارتی قافلے پالی میں مارواڑی تاجروں کی مدد سے منظم ہوا کرتے تھے، لیکن جیسا کہ برنز ہمیں بتاتا ہے کہ مارواڑی اونٹ ایک حد تک تھر کے ریگستان میں سفر کر سکتے تھے، اس کے بعد سامان کو سندھ کے اونٹوں پر لادا جاتا تھا، اس میں بنیوں کی مدد درکار ہوتی تھی۔ لیکن منافع کا خاص ذریعہ ٹیکسوں کی ادائیگی میں تھا جو کہ اس پورے سامان پر ادا کیا جاتا تھا جو کہ مالوہ نے داماؤ جاتا تھا۔ (24) سندھ کے بنئے اس ادائیگی پر اپنا کمیشن وصول کرتے ہوں گے۔ اگرچہ سندھ کی حکومت جو ٹیکس لگاتی تھی، اس کی شرح کے بارے مختلف اعداد و شمار ہیں، اور یہ کہ یہ ہر سال بدلتے بھی رہتے تھے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ سالوں میں افیم کے ٹیکسوں سے سندھ کو خاصی رقم وصول ہو جاتی تھی نومبر 1830 میں ہنری پوٹنجر نے اپنے سندھ کے ایجنٹ کا ایک خط بمبئی روانہ کیا جس میں تحریر تھا کہ 1830ء میں 2 ہزار 4 سو اونٹوں کے سامان پر جو ڈیوٹی ادا کی گئی وہ 5 لاکھ 40 ہزار روپیہ تھی 235 روپیہ ہر اونٹ سے لیے گئے کہ جس پر 8 سورتی من سامان لادا ہوا تھا) (25) مارچ 1839ء میں الکزنڈر برنز نے ان ڈیوٹیز کی تفصیل دی ہے کہ جو سندھ کی حکومت نے 1838ء میں افیون کی تجارت پر لگائی تھیں۔ (26) 234 کوڈا یا کاشانی

روپیہ تھے (یہ دو کرنسیاں اس وقت سندھ میں استعمال ہوتی تھیں) جو کہ ایک اونٹ کے سامان پر لیے جاتے تھے (ہر اونٹ پر دو صندوق ہوتے تھے) کمپنی کے حساب سے یہ 200 روپیہ کے برابر رقم تھی۔ یہ اس کے مقابلہ میں کافی کم تھی کہ جو کمپنی ایک صندوق پر وصول کرتی تھی' جو کہ 125 روپیہ تھی۔ ڈیوٹی کراچی میں وصول کی جاتی تھی' لیکن کچھ ڈیوٹی میرپور میں بھی لے لی جاتی تھی' کیونکہ یہاں پر میرپور خاص کی حکومت حیدرآباد کے امیروں سے علیحدہ تھی۔ 1848ء کی ایک برطانوی دستاویز میں حیدرآباد کے تاجروں کے لیے افیم کی تجارت کے جو فوائد تھے اس کے بارے میں ایک جگہ ذکر آ گیا ہے۔ (27) ایک اور رپورٹ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ شکارپور کے تاجر بھی اس منافع میں شریک تھے۔ لیفٹیننٹ لیچ (Leech) نے اپنی رپورٹ میں اس تجارت پر کہ جو پالی اور شکارپور کے درمیان تھی' افیم کی تجارت کا ذکر نہیں کیا' لیکن اس سرمایہ سے کہ جو شکارپور کے تاجروں نے تجارت میں لگایا تھا اور اس منافع کی شرح سے جو اس سے حاصل ہوا' اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے افیم کی تجارت میں کافی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ (28) 1839 میں مالوہ افیم کی تجارت کو جب مکمل طور پر ختم کر دیا گیا' تو اس کی وجہ سے شکارپور' کراچی اور حیدرآباد کے تاجروں کو سخت نقصان ہوا۔

وہ برطانوی سیاح کہ جو سندھ پر برطانوی قبضہ سے پہلے آئے تھے' وہ اس تضاد کو دیکھ کر پریشان تھے کہ جس میں ہندو معاشی طور پر معاشرہ میں تسلط رکھتے تھے' جب کہ مسلمان سیاسی طور پر بااقتدار تھے۔ لیکن اس تضاد کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے زبردست غلطی کی ہندو دراصل سیاسی معاملات میں معاون کی حیثیت سے شریک تھے۔ ٹالپر دور حکومت میں سندھ کے عامل ریونیو انتظامیہ اور دوسرے سیاسی معاملات میں انتہائی اہم کردار ادا کرتے تھے' اس وجہ سے وہ سندھ میں ایک سیاسی طاقت تھے۔ سندھ میں ہندو جاگیردار بھی تھے' اگرچہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ عاملوں اور تاجروں کو یہ اجازت تھی کہ وہ ہتھیار رکھ سکتے تھے۔ یہ بات دلچسپی کا باعث ہو گی کہ 1790ء میں ٹالپروں کے خلاف کراچی کا دفاع کرنے والے وہاں کے ہندو بنئے ہے جو خان قلات کے ماتحت تھے اور آخر میں انہوں نے ٹالپر میروں کے حق میں دست برداری کی۔ (29) ہندوؤں کی بزدلی کے بارے میں جو روایات مشہور ہیں وہ مسلمان مراد اور برطانوی عہدیداروں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔

برطانوی حکومت کا سندھ کے ہندوؤں کے بارے میں متذبذب قسم کا رویہ تھا ایک طرف وہ ان کے ساتھ شفقت آمیز سلوک کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں یہ مسلمانوں کے مذہبی تعصبات اور تنگ نظری کے شکار لوگ تھے۔ دوسری طرف وہ انہیں چالاک تاجر کی حیثیت سے دیکھتے تھے جو لالچ اور طمع میں غریب کسانوں کا استحصال کرتے تھے اور فضول خرچ زمینداروں کو قرض دے کر لوٹتے تھے ان کے اس کردار کی وجہ سے وہ ان سے نفرت کرتے تھے۔ یہ تاثر کہ سندھ کے ہندو مسلمانوں کے تعصب کا شکار تھے' برطانوی فتح سندھ سے پہلے یہاں آنے والے برطانوی سیاحوں نے قائم کر دیا تھا' خصوصیت سے جس برنز نے۔ لیکن وہ یہ بھی لکھ رہا تھا کہ ''ریونیو کی انتظامیہ پر ہندوؤں کا تسلط تھا'' اس نے ان کے بارے میں لکھا کہ ''بحثیت طبقہ کے دربار میں ان کو پسند نہیں کیا جاتا ہے اور نہ ہی ملک میں ان کا کوئی اثر و احترام ہے حالانکہ وہ دولت مند ہیں'' (30) اس نے ایک واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ جس میں میر مراد علی نے ہندوؤں کے خلاف سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ (31) 1843 کے واقعات کے فوراً بعد نیپیر (Napier) اور اس کے ساتھیوں نے ہندوؤں کو یہ تاثر دیا کہ برطانوی فتح دراصل مسلمانوں کے تسلط سے ان کی آزادی ہے۔ یہ برطانوی حملے اور فتح کو ایک اخلاقی جواز دینا تھا جس کے قبضہ کی اصل وجہ معاشی اسباب تھے۔ نیپیر کے ایک تنقید نگار ایسٹ وک (Eastwick) نے اس سلسلہ میں کہا کہ اگر ہندو مسلمانوں کے ہاتھوں اس قدر غصہ کا شکار تھے تو آخر وہ وہاں سے فرار ہو کر روادار اور فیض رساں برطانوی علاقے میں کیوں نہ آ گئے کہ جو ان سے بہت قریب تھا۔ (32)

اسی طرح یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ ٹالپروں کی حکومت میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات مثالی تھے۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ قبل از نو آبادیاتی سندھ میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک خاص مرحلہ پر خود کو علیحدہ علیحدہ کمیونٹی سمجھتے تھے' سیٹھ ناؤمل ہوت چند کی یادداشتوں میں 1831ء کے ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ جس میں ہندو مسلم فسادات نے پورے علاقہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سیٹھ ناؤمل کا باپ سیٹھ ہوت چند اس وقت سندھ کا سب سے بڑا مالدار شخص تھا' جب یہ فرقہ وارانہ فساد میں ملوث ہوا تو اسے مسلمان مجمع نے پکڑ لیا اور مجبور کیا کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ اس وقت یہ افواہیں بھی تھیں کہ اس کی زبردستی ختنہ کر دی گئی تھی' جو کہ صحیح نہیں تھی۔ آخر کار میر مراد علی نے اس معاملہ میں دخل دے کر اسے آزاد کرایا لیکن سیٹھ اس واقعہ سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ وہ سندھ چھوڑ کر

کچھ کے راؤ کے پاس چلا گیا۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو اختلافات چھپے ہوئے تھے وہ کس طرح اچانک ابھر کر سامنے آ گئے اور فساد کی شکل اختیار کر گئے۔ ٹالپر حکمرانوں نے اس واقعہ میں جو متذبذب کردار ادا کیا اس کی قیمت جلد ہی انہیں ادا کرنی پڑی کیونکہ نوجوان سیٹھ ناؤمل اس ذلت کو فراموش نہیں کر سکا اور اس نے برطانوی فتح کے موقع پر ان کا بھرپور ساتھ دیا لیکن انہیں یادداشتوں میں ایک اور بیان بھی ہے جو کہ ہندو مسلمان تعلقات پر بالکل ایک دوسرے انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ جب سیٹھ ہوت چند کو آزاد کیا گیا تو اس نے لوگوں میں یہ اعلان کیا کہ اب وہ سب چھوڑ چھاڑ کر ایک صوفی فقیر بننا چاہتا ہے۔(33) اس کے فٹ نوٹ میں جو کہ ان یادداشتوں کا ایڈیٹر اور سندھ کا سابق کمشنر تھا' اس نے سیٹھ کی وفات کے بعد ہماری معلومات کے لیے یہ لکھا کہ ''شاید سیٹھ ہوت چند کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک ہندو جوگی بننا چاہتا تھا'' ہمیں یقین ہے کہ سیٹھ ناؤمل کو ہندو جوگی اور مسلمان فقیر کے درمیان فرق معلوم تھا۔ اس لیے سیٹھ ہوت چند نے جو اعلان کیا وہ اس کو پوری طرح سے معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور دیکھا جائے تو اس میں کوئی زیادہ حیرانی کی بات بھی نہیں ہے۔ کیونکہ سندھ اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں یہ روایت تھی کہ مسلمان صوفی اور پیر مذہب بدلے بغیر لوگوں کو مرید کر لیا کرتے تھے۔

میں نے اس واقعہ کا ذکر اس لیے کیا ہے تاکہ سندھ میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کی پیچیدگیوں کو سمجھا جا سکے' یہ اس قسم کے تعلقات تھے کہ جن میں مخالفت اور تصادم کے ساتھ ساتھ باہمی دوستی اور مذہبی یگانگت کے رویے موجود تھے ان دونوں کے تعلقات میں یہ رویے اور رجحانات اس طرح باہم ملے ہوئے تھے کہ ٹالپر حکومت میں سندھ کے ہندوؤں کے بارے میں کوئی ایک بات کہنا سخت غلطی ہوگی۔(34) اس میں کوئی شک نہیں کہ کراچی اور حیدرآباد میں رہنے والے ہندو، تاجر سماجی طور پر طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے اور ٹالپر حکومت کے حکمران طبقوں کا ایک حصہ تھے' اگرچہ سماجی طور پر شاید وہ ان وڈیروں' سیدوں اور پیروں کے برابر نہ ہوں کہ جو ملک کے کاشتکاروں اور کسانوں پر حکومت کرتے تھے۔ ہندوؤں کا یہ طبقہ اعلیٰ حکمران طبقوں سے قریبی تعلقات رکھتا تھا۔ عاملوں کے طبقے کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ ان کا کوئی سیاسی اثر و رسوخ نہیں تھا' مگر یہ ضرور ہے کہ اپنی اس طاقت کا وہ اظہار نہیں کرتے تھے۔ تاجر برادری کے

دوسرے لوگ کہ جن میں دوکاندار، ساہوکار وغیرہ تھے، ان کا تعلق سندھ کے درمیانی طبقوں سے تھا، اور سماجی طور پر یہ ہاریوں کے مقابلہ میں زیادہ اہم تھے۔ سندھ کے ہندوؤں کے ان مختلف طبقات کے پیش نظر یہاں نوآبادیاتی نظام کا اثر بھی اسی طرح سے غیر مساوی اور تقسیم شدہ تھا۔ اس لیے مناسب ہے کہ یہاں نوآبادیاتی دور کے ہندو معاشرے کا تجزیہ کیا جائے۔

نوآبادیاتی سندھ میں ہندو معاشرہ: کچھ عمومی رجحانات

پندرھویں سے لے کر اٹھارویں صدی میں جب سندھ میں اسلام پھیلا اور یہاں کے کسانوں نے اسے قبول کرنا شروع کیا، تو اس کے نتیجہ میں ہندو اقلیت میں ہو گئے، لیکن ان کی اس قدر تعداد ضرور رہی کہ جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی شناخت کو برقرار رکھا۔ اس کمیونٹی کے مطالعہ کے سلسلہ میں اہم ماخذوں کی بڑی کمی ہے، اگرچہ ان سے متعلق سستا قسم کا ہم عصر مواد ضرور موجود ہے۔ سندھ پر برطانوی قبضہ سے پہلے سندھ کے ہندوؤں نے مذہب کے علاوہ اور کوئی دوسرا تحریری مواد نہیں چھوڑا، مذہبی ادب میں وہ بھجن ہیں کہ جو نانک پنتھیوں نے بطور عقیدے لکھے۔ عاملوں اور بنیوں نے بھی وقتاً فوقتاً سندھ کے صوفی ادب میں اپنی تحریروں سے اضافہ کیا۔ سندھ کی صوفیانہ روایات شاہ عبداللطیف کی شاعری میں اپنی بلندی کو چھوتی نظر آتی ہیں۔ برطانوی دور حکومت میں بھی کہ جب ان میں خوانگی کی شرح بڑھ گئی تھی، خاص طور سے عامل طبقہ میں تعلیم کا زیادہ رواج ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے ہندو کلچر اور سماج کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ (35) اہل برطانیہ نے بھی سندھ کے ہندوؤں پر کوئی زیادہ توجہ نہیں دی، انہیں وہ سندھ کے سماج میں ''غیر ملکی'' خیال کرتے رہے۔ اس کے مقابلہ میں نوآبادیاتی اسکالرشپ نے کہ جس کی تحقیق اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اس نے مسلمان معاشرہ اور کلچر پر توجہ مرکوز رکھی۔ اگرچہ نوآبادیاتی انتظامیہ نے کچھ بنیادی معلومات اکٹھی کر کے گزٹیئرز میں چھاپیں، خاص طور سے 1907 کے ایڈیشن میں یہ معلومات کافی ہیں۔ (36) چونکہ اب تک سندھ پر کوئی زیادہ تحقیق اور مطالعہ نہیں کیا گیا ہے، اس لیے جب تقسیم سے پہلے سندھی ہندوؤں کے بارے میں لکھا جاتا ہے تو اسی مواد پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ 1947ء کی تقسیم کے بعد جب کہ یہاں ہندوؤں کی تعداد گھٹ کر بہت معمولی رہ گئی۔ اس لیے اب اس سے کسی کو زیادہ دلچسپی نہیں کہ تاریخ میں ان کے کردار کا جائزہ لیا جائے۔ ہندوستان

کے جہاں تقسیم کے بعد ہندو آبادی کی اکثریت ہجرت کر گئی' وہاں 1950ء کی دہائی میں ایک سروے کرایا گیا' اس کی بنیاد پر سندھی ہندو کلچر اور سماج پر پہلی مرتبہ یو۔ ٹی۔ ٹھاکر کی کتاب ''سندھی کلچر'' شائع ہوئی۔ (37) اگرچہ اس کتاب میں کافی کمزوریاں ہیں' پھر بھی مصنف نے سندھی شرنارتھیوں سے ملاقات کر کے اس سندھی سماج اور کلچر کے بارے میں مواد جمع کیا ہے کہ جب وہ سندھ میں تھے' اس نے اس ورثہ کو محفوظ کر لیا کہ جو بصورت دیگر گم ہو جاتا۔ اس کے علاوہ دوسرا ادب جو تخلیق ہو رہا ہے اس میں زیادہ توجہ اس امر پر ہے کہ وہ ہندوستان کے معاشرے میں کس طرح گھل مل گئے ہیں' وہ تقسیم سے پہلے کے سندھ سے خود کو اب دور رکھنا چاہتے ہیں۔

یہاں پر سندھ میں ہندو سماج کے بارے میں جو معلومات دی گئی ہیں' وہ اس بکھرے ہوئے اور ناکافی مواد پر مبنی ہے جس کی وجہ سے 1947ء سے پہلے کے سندھ کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ لکھی نہیں ہے۔ جو معلومات ہندوستان سے اکٹھی کی گئی ہیں وہ وہاں کی ہندو سوسائٹی سے مختلف ہیں۔ مثلاً سندھی ہندو سماج کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ذات پات کی اور سختیاں نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سماج میں لوہانا قبیلہ کا تسلط ہے' اور اس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ پورے ہندو سماج کا تعلق اسی ایک قبیلہ سے۔ حالانکہ جو مختلف اوقات میں جو مردم شماریاں ہوئی ہیں' ان میں لوہانا قبیلہ کی تعداد نصف ہے۔ (38) لیکن یہ اعداد و شمار صرف ادھوری کہانی بتاتے ہیں۔ 1947ء میں غیر لوہانہ لوگوں کا تعلق تھر اور پارکر کے ان قبیلوں سے تعلق تھا جو کہ ہندو سماج میں حاشیہ پر تھے۔ چونکہ ان قبیلوں کو شامل نہیں کیا گیا' اس وجہ سے لوہنا اکثریت اور زیادہ غالب حیثیت اختیار کر گئی۔ ہندوؤں کی دوسری ذاتیں جیسے بھاٹیہ اور کھتری وہ لوہنا کے بہت قریب تھیں اور ان میں آپس میں شادی بیاہ ہوا کرتے تھے۔ صرف ایک طبقہ جو لوہنا سے علیحدہ تھا وہ برہمنوں کا تھا' جن کے درمیان دو ذاتیں تھیں۔ سرسوت اور پش کرن۔ لیکن برہمنوں کی تعداد اس قدر کم تھی کہ ان کی نمائندگی پوری طرح سے نہیں ہوتی تھی' اس لیے لوہنا کے مقابلہ میں وہ ہندو سماج میں اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سندھ میں برہمنوں کا کردار محض مذہبی تھا اور یہ کوئی اونچی ذات نہیں تھی۔

سندھی ہندو سماج اور لوہنا ذات کے درمیان اس مناسبت کے بعد یہ بتانا ضروری ہے کہ لوہنا ذات کے اندر ایک درجہ بندی تھی' یہ درجہ بندی تین قسم کی تھی: ان میں سب سے اعلیٰ درجہ کے

درمیان فرق کو قائم کر دیا تھا' یہاں پر یہ فرق نہیں تھا۔ (39) اس وجہ سے یہ کہنا مشکل تھا کہ کیا نانک پنتھی خود کو سکھ کہتے ہیں یا ہندو۔ 1881 کی مردم شماری میں شکار پور اور حیدر آباد کے لوہانوں نے خود کو سکھ لکھوایا تھا' لیکن 1889 کی مردم شماری میں سب ہندو ہو گئے (40) سندھ میں برہمنوں کی ذات کوئی زیادہ بااثر نہیں تھی ان کی تعداد کم تھی۔ یہ جو صرف شہرون میں تھے یہ ان کے مقابلے میں ''بادا'' نانک پنتھی دیروانت تھے جو کہ ہر گاؤں اور شہروں کی ہر گلی میں پائے جاتے تھے اور یہ مندر گردوارا جو کہ ''ٹھکانہ'' کہلاتا تھا اس کا انتظام کرتے تھے۔ ان ٹھکانوں میں ہندو مت کے بتوں کے ساتھ ساتھ گرنتھ صاحب اور بابا نانک کی شبیہ بھی رکھی ہوتی تھی۔ اس مذہبی ہم آہنگی میں ان کے ہاں ''اوڈیرولال'' جو کہ ''جھولے لال'' بھی کہلاتا ہے اس سے عقیدت مندی کا اظہار ہوتا تھا۔ (41) صدیوں تک ''جھولے جھولے لال'' وہ نعرہ تھا کہ جس کے گرد مصیبت کے وقت سندھی ہندو جمع ہو جاتے تھے۔ یہ وہ علامت تھی کہ جس کے ذریعہ وہ ایک ہو کر اپنے مسلمان حریفوں کے مقابلہ میں اپنی شناخت کو برقرار رکھتے تھے۔

لیکن سندھ میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ہاں جو مذہبی یگانگت کا عنصر تھا وہ یہ کہ دونوں باہم مل کر ان صوفیوں اور پیروں سے عقیدت مندی کا اظہار کرتے تھے کہ جن کا تعلق ہندو اور اسلام سے تھا۔ اس قسم کی شہادتیں ہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت کسی مسلمان پیر کی مرید ہوا کرتی تھی' جنہوں نے سندھ میں اسلام کے پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ (42) اگر برصغیر ہندوستان میں یہ رسم عام ہے کہ ہندو مسلمان پیروں کے مرید ہوتے ہیں' مگر سندھ میں خاص طور

لوگ عامل کہلاتے تھے' اور نچلے درجہ کے لوگ بھائی بند۔ اس کے بعد عاملوں اور بھائی بندوں میں بھی مزید اور درجہ بندی تھی۔ دراصل عامل اور بھائی بند کے درمیان فرق بڑا قریبی تھا۔ یہ فرق لوہانہ ذات کے ان لوگوں میں اس وقت ہوا کہ جب انہوں نے حکومت کی ملازمتیں اختیار کیں اور خود کو دوسرے ساتھیوں سے کہ جو تجارت کے پیشہ میں تھے الگ کر لیا۔ انیسویں صدی میں عامل اور بھائی بند کے درمیان یہ فرق ذات کی علیحدگی کی مانند ہو گیا' فرق یہ تھا کہ عامل بھائی بندوں میں شادی کر لیتے تھے لیکن انہیں اپنی لڑکی نہیں دیتے تھے۔ اس طرح سماج کے یہ دو طبقہ ایک دوسرے سے منسلک بھی تھے۔ یہ فرق خدا آبادی عامل (یہ کلھوڑوں کے قدیم دارالسلطنت سے تعلق رکھتے تھے) جو کہ سماج کی سب سے اونچی پرت سے سمجھے جاتے تھے اور غیر خدا آباد عامل کہ جن کا درجہ ان کے مقابلہ میں کم تھا۔ یہ دونوں آپس میں شادی بیاہ سے گریز کرتے تھے۔ حیدر آباد سے باہر ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت مختلف تھی' مثلاً لاڑکانہ میں چانڈوکا کے عاملوں کا سماجی رتبہ دوسروں کے مقابلہ میں افضل تھا۔

لوہانوں میں شرح کے لحاظ سے عاملوں کی تعداد 10 سے 15 فیصد تک تھی۔ جب کہ غیر عامل جن کی تعداد زیادہ تھی وہ دوسرے ناموں سے پکارے جاتے تھے' جیسا کہ کہا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ ممتاز بھائی بند تھے۔ اس اصطلاح کا مطلب ''بھائیوں کی جماعت'' ہے۔ سندھیوں میں تجارتی فرمیں بھی بھائی بند کے نام سے موسوم تھیں۔ سماج میں ''بھائی بند'' کا مرتبہ کسی ذات پات سے نہیں بلکہ ان کے پیشہ اور ان کی دولت سے متعین ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ لوگ کہ جن کے پاس اناج کی سپلائی کا کام تھا اور ان کی یہ فرمیں ''کوٹھی'' کہلاتی تھیں' وہ دوسرے تاجروں کے مقابلے میں کہ جن میں گاؤں کے دکاندار اور ساہوکار شامل تھے جنہیں ''ہاٹ ورنیا'' کہتے تھے ان کا رتبہ اونچا تھا شکار پور کے صراف اور حیدر آباد کے کپڑے کی صنعت میں کام کرنے والوں کی برادریاں بھی سماج میں احترام سے دیکھی جاتی تھیں۔

ذات پات کے اس فرق کے نہ ہونے کے بعد' سندھی ہندو سماج کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی ان کی مذہبی شناخت اور اس سے تعلق بھی بدلتا رہتا تھا۔ سندھ میں ہندوؤں کی اکثریت نانک پنتھی' شیومت اور وشنومت سے مل گیا تھا' ان میں متاخر کی سندھ میں اکثریت تھی۔ اس وجہ سے سندھ پنجاب کی طرح سنگھ سبھا تحریک سے متاثر نہیں ہوا' جس نے ہندوؤں اور سکھوں کے

وشوق سے محرم کی تقریبات میں حصہ لیا کرتے تھے۔ (43)

بہر حال مذہبی اشتراک ان دو کمیونٹیز میں تصادم اور کشمکش کو ختم نہیں کر سکا اگرچہ یہ شمالی ہندوستان کے مقابلہ میں بہت کم تھا 1920ء سے سندھ کی سیاست میں آہستہ آہستہ فرقہ واریت آتی چلی گئی۔ ہندو خود کو کانگرس سے جوڑنے لگ گئے' جب کہ مسلمان اس سے دور رہے اور 1930ء اور 1940ء کی دہائیوں میں جا کر وہ مسلم لیگ سے جڑے۔ (44) لیکن اس پر اتفاق ہے کہ 48-1947ء میں سندھ سے ہندوؤں کا ہجرت کرنا' سندھ کے اندرونی فرقہ وارانہ فسادات اور' سندھ کے ہندو مسلمانوں کے درمیان تضادات نہیں تھے' بلکہ یہ تقسیم کے منطقی نتائج اور پنجاب میں ہونے والے خوں ریز فسادات تھے۔ (45) اگرچہ یہ کہنا تو درست نہیں کہ سندھ میں مکمل طور پر مذہبی ہم آہنگی یا رواداری تھی' لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں یعنی پنجاب بنگال اور یوپی کے مقابلہ میں یہاں مذہبی اختلافات اور تضادات کم تھے۔ (46) اور اس مذہبی اشتراک اور ہم آہنگی میں کیا جا سکتا ہے ان میں یہاں کے صوفیاء نے موثر کردار ادا کیا۔

ہندو بنئے اور نوآبادیاتی دور میں سیاسی و معاشی حالت

اس نقطہ نظر کو عام طور سے تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ سندھ کی برطانوی فتح کے بعد جو سماجی اور معاشی تبدیلی ہوئی اور معاشرے کی ساخت کی تشکیل نو ہوئی اس کا سب سے زیادہ فائدہ ہندو بنیوں کو ہوا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نقطہ نظر کی بھی وضاحت کی جائے۔ اس سلسلہ میں اس

سے برطانوی عہدے دار اور غیر عہدے دار دونوں ہی متاثر ہوئے اور ہندوؤں کے بارے میں اس کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کی چونکہ یہ کتاب نوآبادیاتی بحث ومباحثہ میں نہیں آتی ہے اس لیے میں اس پر روشنی نہیں ڈالوں گا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس کی کتاب نے ایک ایسے رجحان کو پیدا کیا کہ جس کے اثرات دیرپا اور دوررس ہوئے اور اس نے ہندوؤں کے بارے میں سطحی خیالات کو پیدا کرنے میں مدد دی۔

ہندوؤں کے خلاف جو سب سے اہم بات کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندو بنیوں نے اپنے ہتھکنڈوں کے ذریعہ زرعی زمینوں کو اپنے نام تبادلہ کرا لیا۔ اگر تبادلہ کی کچھ شہادتیں تو ہیں مگر یہ مشکل ہے کہ اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دی جائے۔ اول تو اس کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات نہیں ہیں کہ برطانوی قبضہ کے وقت ہندوؤں کے پاس کتنی زمین تھی۔ برطانوی عہدیداروں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ان معاملات میں واقعات کو سابقہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں' خاص طور سے اس صورت حال میں جب کہ معاملہ ساہوکار اور سودخوروں کا ہو۔ جو ان کے نزدیک مفت کے منافع خور تھے۔ لہٰذا انہوں نے مختلف قوانین پاس کرائے تا کہ زمینوں کا تبادلہ نہ ہو سکے' اس کی ابتداء 1896ء (Sind Encumberel Estate Act) کے ذریعہ ہوئی۔ 1896ء میں سندھ کے کمشنر سر اوان جونس (Sir Evan Jones) نے یہ دعویٰ کیا کہ 42 فیصد زمین ہندوؤں کے پاس رہن رکھی ہوئی ہے۔ (49) اس کے بعد سے اور قوانین پاس کیے تا کہ کسان اور زمیندار قرض کے عوض اپنی زمینیں رہن نہ رکھ سکیں۔ دیکھا جائے تو یہ سندھ کی زرعی تاریخ کے دو نمایاں ادوار ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف میں' ہندوؤں بنیوں نے بہت زیادہ تعداد میں زمینوں کو حاصل کر لیا تھا' بالواسطہ یا بلاواسطہ دونوں طریقوں سے لیکن یہ رجحان بیسویں صدی میں جا کر رک گیا۔

ڈیوڈ چیس من (David Cheesman) (50) جس نے سندھ میں سودی کاروبار پر تفصیل سے کام کیا ہے' اس نے بدقسمتی سے اپنی تحقیق کا دائرہ انیسویں صدی تک رکھا ہے اور اپنی تحقیق کو بیسویں صدی کے نصف تک نہیں لایا۔ چیس من کی دلیل یہ ہے بنئے بنیادی طور پر تاجر تھے

اور قرض پر روپیہ دے کر اس کے ذریعہ سے وہ زراعتی پیداوار کو ہتھیا لیتے تھے۔ وہ سود کے ذریعہ رقم لینے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے' ان کو زیادہ فائدہ اس زرعی پیداوار سے ہوتا تھا جو وہ زمینداروں اور کسانوں سے قرض کے عوض لیتے تھے اور اسے منڈی میں بیچ کر منافع حاصل کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ جھگڑوں اور تنازعات کو عدالت تک نہیں پہچانا چاہتے تھے' یہ قدم اس وقت اٹھاتے تھے کہ جب اور کوئی راستہ نہیں رہتا تھا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان کے لیے زمیندار ہونا یا زمینوں پر قبضہ کرنا کوئی منافع بخش کاروبار نہیں تھا' کھیتی باڑی کے لیے کسانوں سے کام کرانا ان کے لیے مشکل تھا۔ چیس من کا یہ تجزیہ اس سے مطابقت رکھتا ہے کہ جو نیلا دری بھٹا چاریہ نے پنجاب کے سلسلہ میں کیا ہے جو کہ ساہوکاروں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر کے ان میں فرق بتاتا ہے ان میں سے ایک کو وہ سود خور کہتا ہے' جن میں اکثریت پٹھانوں کی ہے جو کہ مختلف عرصہ کے قرضہ پر بہت زیادہ سود کی شرح پر پیسے وصول کرتے تھے' یہ اپنے سود کی وصول کے لیے مسلسل دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ دوسری جماعت کو وہ تاجر سود خور کہتا ہے جو کہ کم شرح پر قرضہ دیتے تھے اور اس کے عوض زرعی پیداوار وصول کرتے تھے۔ (51) اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس قسم کا فرق ہمیشہ رہا' لیکن سندھ میں بنیوں کا تعلق دوسری جماعت سے تھا جو کہ سود کے عوض زرعی پیداوار حاصل کرتے تھے' یعنی یہ تاجر سود خور یا ساہوکار تھے۔

چیس من نے انیسویں صدی کے سندھ کے بارے میں جو تحقیق کی ہے اس کی بنیاد سرکاری دستاویزات پر ہے' لیکن اس کا نقطہ نظر سرکاری عہدیداروں کے مقابلہ میں مختلف ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ اس امر کے باوجود کہ سندھ کی زمین بنیوں کے ناموں منتقل ہوئی۔ وڈیرہ نے سندھ کے دیہات میں اپنے اثر ورسوخ کو برقرار رکھا۔ اس لیے برطانوی عہدیداروں کا یہ ڈر کہ وڈیروں کی زمینوں سے بے دخلی سندھی معاشرے میں تبدیلی لائے گی اور اس مقصد کے لیے انہوں نے جو مختلف قوانین پاس کرائے' وہ سب محض رسمی ثابت ہوئے۔ انہوں نے اس کی جڑ پر کوئی حملہ نہیں کیا جو کہ قرضہ لینے کی عادت تھی۔ اس کے عوض انہوں نے وڈیرے کو یہ تاثر دیا کہ سرکار ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتی ہے' لہٰذا ان کا یہ فرض ہے کہ وہ بغیر کسی تذبذب کے حکومت برطانیہ سے

اپنی وفاداری کو برقرار رکھیں۔ برطانوی دور میں سندھ کے معاشرے کی ساخت میں کوئی بہت اہم تبدیلیاں نہیں آئیں۔اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بنئے زمین حاصل کرتے تھے' اوران زمینوں کا انتظام بھی عمدہ اور بہترین طریقے سے کرتے تھے۔(52) لیکن بہت سے معاملات میں وہ وڈیرے پر انحصار کرتے تھے' خاص طور سے جب ہاریوں سے بات چیت کی جاتی تھی۔ چونکہ بنیوں کا تعلق ایسے طبقہ سے تھا کہ جس کا سماجی طور پر وڈیروں' پیروں اور سیدوں سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔اس لیے وہ یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ ہاری ان کے ساتھ وفادار رہیں گے' یا ان سے ڈریں گے اوران کی اطاعت کریں گے۔ان کا دیہات میں آنا محض اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے وڈیروں کو قرضہ دیا تھا اور وڈیرہ اس کے عوض ان کے لیے ہاریوں کو کنٹرول کرتا تھا۔اس کے باوجود سندھ کے دیہات میں سودخوروں کے قتل ہوتے رہتے تھے۔ان کے قاتل بہت کم حالات میں پکڑے جاتے اور سزا پاتے تھے۔(53) شہادتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہاری اچانک جذبات میں آ کر بطور انتقام یہ قتل نہیں کرتا تھا' بلکہ اس کے پس منظر میں وڈیرہ ہوتا تھا جو اس قسم کے واقعات میں ملوث ہوتا تھا اور سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ قتل کرائے جاتے تھے لہٰذا اپنی دولت کے باوجود' جو بنئے کے پاس اچھی خاصی تعداد میں ہوتی تھی' وہ اس قابل نہیں تھا سندھ میں ایسا کردار ادا کر سکے کہ جو اس کے تسلط کو قائم کر دے۔

اس سے اس کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ آخر سندھی ہندو بنیوں نے کیوں انیسویں صدی کے نصف میں سندھ سے باہر تجارت کی راہیں تلاش کیں۔اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انہیں اپنی دولت کے باوجود دیہات میں جو عدم تحفظ تھا' اس میں وہ پوری طرح سے اپنا کاروبار نہیں کر سکتے تھے' اس وجہ سے سندھ سے باہر ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔اس سلسلہ میں اناج کی قیمتوں کا بھی دخل ہے' کیونکہ ان کی تجارت کا ذریعہ یہی زرعی پیداوار تھی۔اعداد وشمار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اناج کی قیمت انیسویں صدی کے نصف میں بڑھ رہی تھی۔(54) اور اس سے بنیوں کے منافع میں اضافہ ہو رہا تھا' لیکن اس عدم تحفظ کی وجہ سے جو دیہات میں تھا' ان کے لیے یہ منافع بھی کاروبار کو مزید پھیلانے میں رکاوٹ تھا۔اگرچہ بنیوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جو ہر طرح کے خطرات

مول لیتے تھے' مگر بہرحال ان خطروں کی بھی ایک حد ہوتی تھی۔ ان کا ایک رجحان یہ بھی تھا کہ سرمایہ کو ایک ہی قسم کی تجارت میں نہ لگایا جائے' لیکن برطانوی حکومت کے دوران انہیں سرمایہ کاری کے اور مواقع نہیں تھے جہاں وہ دیہات سے نکل کر اپنی تجارتی صلاحیتوں کو آزمائیں۔

جب برطانیہ نے سندھ پر قبضہ کیا ہے تو اسے چار مسائل کا سامنا کرنا پڑا: ریاست کے مالی انتظام' کرنسی کا تبادلہ' صنعتی پیداوار اور سندھ کے راستے گزرنے والی تجارتی اشیاء۔ جہاں تک ریاستی مالیاتی انتظام کا تعلق تھا تو اس میں اہل برطانیہ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی' کیونکہ سندھ پر قبضہ سے پہلے ان کا ہندوستانی مقبوضات میں مالی انتظامی ڈھانچہ موجود تھا' اس لیے انہیں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ مقامی بنکرز سے قرضہ لیں' جب کہ اس پہلے بنکرز ریاست کو قرضہ دیا کرتے تھے اور یہی ان کی خاص تجارت تھی' خاص طور سے حیدرآباد کے بنکرز۔ اب جب کہ یہ تجارت نہیں رہی تو ان کے لیے ضروری تھا کہ اس کے بجائے کوئی دوسرا راستہ تلاش کریں۔ کرنسی کے تبادلہ کی جو تجارت تھی۔ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا' کیونکہ کمپنی کا روپیہ قانونی طور پر کرنسی بن گیا اور مقامی کرنسیاں ختم ہو گئیں۔ جہاں تک سندھ کے راستے سے گزرنے والی تجارتی اشیاء کا مسئلہ تھا جو ہمسایہ ملکوں کو جاتی تھیں' اس میں بھی کمی آ گئی' خاص طور سے مالوہ افیم کی تجارت بالکل بند ہو گئی۔ قلات اور افغانستان میں حالات کے بگڑنے کی وجہ سے وسط ایشیا کی تجارت کے راستے غیر محفوظ ہو گئے۔ دریائے سندھ کے راستے پنجاب اور وسط ایشیا کی تجارت بھی کوئی زیادہ فائدہ مند نہیں رہی۔ دست کاری کی اشیاء اور دوسری صنعتی پیداوار میں اس لیے زوال آیا کیونکہ اب دربار اور فوج میں ان کی مانگ نہیں رہی' جو کہ اس کے سب سے اچھے خریدار تھے' جو تاجر کے دست کاری اور صنعت میں سرمایہ لگاتے تھے اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ اس میں مزید سرمایہ کاری کر سکیں۔ لہٰذا یہ وہ حالات تھے کہ جن میں سندھ پر قبضہ کے بعد بنئے ان مواقعوں کی تلاش میں تھے کہ جہاں وہ سرمایہ کاری کر سکیں۔

1843 ۔1875 ء میں سندھی قبیلوں میں ایسے مہم جو تھے جو کہ تجارت کے لیے نئے راستوں اور سرمایہ کاری کے لیے نئے طریقوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ شکارپورہ اور ٹھٹھہ

کے بھاٹیہ اپنے پہلے سے قائم شدہ تجارتی رشتوں کو مضبوط کر رہے تھے' جب کہ حیدرآباد کے تاجروں نے بالکل نئے ذرائع کی تلاش شروع کر دی۔

سندھ نے برطانوی ہند کی معیشت میں جو حصہ لیا اس کی وجہ سے بھی حالات میں تبدیلی آئی۔ قبضہ سے پہلے سندھ بین الاقوامی اور علاقائی تجارت میں حصہ لیتا تھا' لیکن برطانوی اقتدار کے بعد اس کو پنجاب کی زرعی پیداوار کے لیے راستہ دینے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس غرض سے انیسویں صدی کے نصف میں برطانوی حکومت نے سندھ میں سب سے زیادہ سرمایہ کاری کراچی کی بندرگاہ کو پھیلانے اور ریلوے لائنز بچھانے کے لیے کی تاکہ پنجاب سے بندرگاہ کا رابطہ ہو جائے۔ (55) 1847 میں یہ فیصلہ کہ سندھ کو بمبئی پریذیڈنس سے متعلق کر دیا جائے' یہ ایک دورس فیصلہ ثابت ہوا' کیونکہ سندھ کا بمبئی سے معاشی اور ثقافتی طور پر بہت کمزور رشتہ تھا' یہ بمبئی کی جانب سے پنجاب کے لیے ایک بلاواسطہ سہولت تھی کہ جو اسے دی گئی۔ (56) اس طرح سندھ کو جب پنجاب کی زرعی پیداوار کے لیے منتخب کیا گیا تو اس سے کراچی کو بہت فائدہ ہوا' دوسری طرف ریلوے کی وجہ سے ان شہروں نے فائدہ اٹھایا کہ جہاں سے یہ گزرتی تھی۔

اس مرحلہ پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب کا تجزیہ کیا جائے کہ جن کی وجہ سے سندھ کے بنئے اپنے صوبے کی تجارت پر اپنا روایتی تسلط قائم نہیں رکھ سکے' اور انہوں نے غیر مقامیوں کو یہ موقع دیا کہ وہ کراچی آ کر وہاں کی معیشت اور تجارت کو اپنے کنٹرول میں لے لیں۔ ان اسباب میں کچھ کا تعلق تو سندھ پر برطانوی قبضہ کا ہے۔ 1839ء کے بعد سے اور پھر 1843ء میں فتح سندھ کے بعد بمبئی میں واقع برطانوی تجارتی کمپنیوں نے اپنے سرمایہ اور تجربہ کی بنیاد پر کہ جو انہیں غیر ملکی منڈیوں کے بارے میں تھا' خاص طور سے روئی کی تجارت کا' انہوں نے کراچی کی تجارت میں سرمایہ کاری کر کے وہاں اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس کا مظہر 1860ء میں کراچی چیمبر آف کامرس کا قیام ہے جو ان تجارتی کمپنیوں کے تعاون سے قائم ہوا۔ (57)

لیکن ان کے ساتھ ہی دوسری تاجر برادریاں جو برطانوی ہند سے اور خاص طور سے بمبئی سے کراچی آئیں اور یہاں آ کر شہر کی منڈیوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم پارسی ٹھیکیدار تھے' انہوں نے جلد ہی برطانوی فوج اور عہدیداروں کے لیے سپلائی کے

ٹھیکے لے کر اس پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ لیکن جلد ہی انہوں نے دوسرے کاروبار میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے نصف میں پارسی کراچی میں سب سے زیادہ طاقتور تجارتی جماعت تھی۔(58) بمبئی سے آنے والے دوسرے تاجروں میں یہودی اور گجراتی بنئے تھے۔ ان کے علاوہ سندھ پر قبضے سے پہلے جو دوسری تاجر برادریاں اہم تھیں ان میں اسماعیلی خوجے اور کچھی میمن تھے، فتح سندھ کے بعد ان کو مزید تقویت اس وقت ملی کہ جب ان کی برادریوں کے مزید تاجر کراچی آنا شروع ہو گئے' آنیوالوں میں اکثریت بمبئی اور کچھ کی تھی کراچی بندرگاہ کا پنجاب سے تعلق قائم ہوا اور شمال ہندوستان کے علاقوں کی قربت کی وجہ سے یہاں پنجابی اور مارواڑی سیٹھ بھی آئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سندھی بنیوں کی تجارتی کمپنیاں جو برطانوی قبضہ سے پہلے تھیں، جیسے سیٹھ ناؤمل اور وسن داس کھیم چند کی' ان کا بڑی تیزی سے زوال ہوا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جو بنیا گروپ کراچی میں برقرار رہا وہ شکارپوریوں کا تھا' انہوں نے کراچی کی بڑی کمپنیوں اور سندھ کے شہروں وقصبوں کے درمیان ''مڈل مین'' کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنی حیثیت کو مستحکم رکھا۔(59) اس کے علاوہ انہوں نے اپنے وسط ایشیا کے تعلقات کو برقرار رکھتے ہوئے برطانوی صنعتی پیداوار کو جنوب مشرق ایران کی منڈیوں میں فروخت کیا۔ لیکن مجموعی طور پر یہ درست ہے کہ اس دورانیہ میں سندھی بنیوں نے اپنی اجارہ داری اور تجارت پر تسلط اپنے ہی صوبہ میں کھودیا۔ یہ وہ حالات تھے کہ جن میں حیدرآبادی اور شکارپور کے بنیون نے اپنے لیے دوسرے علاقوں کی تلاش کی' اور اپنی تجارت کے لیے نئی راہوں کو ہموار کیا۔ شکارپوریوں نے کوشش کی کہ اپنے ہی ملک میں کوئی راستہ ڈھونڈیں' جب کہ حیدرآبادیوں نے صوبہ سے نکل کر بمبئی کی راہ لی' جو آگے چل کر ان کے لیے فائدہ مند ہوئی۔

اس تجزیہ کے بعد یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کس طرح اندرون سندھ کی دو تاجر برادریوں نے ایک ایسا تجارتی جال پھیلایا کہ جس میں ایک طرف وسط ایشیا' جنوب مشرق ایران اور جنوب مغرب سنکیانگ تھا' تو دوسری طرف وہ دنیا تھی جو سمندری راستوں پر پھیلی ہوئی تھی' جس میں جاپان کے کوبے (Kobe) سے لے کر وسطی لاطینی امریکہ کا پانامہ شامل تھا۔ ان دنیاؤں میں شکارپوری اور حیدرآبادی تاجر تجارت میں مصروف تھے۔

References

1. C.A Bayly writes in *Imperial Meridian: the British Empire and the World 1780-1830*, London, 1989, p. 48; 'Emerging from out of the brief Afghan Empire of the Durranis, magnates from tribal backgrounds in Sindh (the Talpur emirs) had built up a viable political system by the 1790s' thus signalling a considerable shift in current historio-graphical views on pre-colonial Sind.
2. For an altogether favourable account of Napier, see H. T. Lambrick, *Sir Charles Napier and Sind*, Oxford, 1952.
3. See C. L. Mariwalla, *History of the Commerece of Sind (From Early Times to 1526 AD),* Jamshoro, 1981, p. 16.
4. See Wink, *Al Hind,* vol. I, p. 51: 'The desire to expand traffic along the Persian Gulf route was... the main motivation for the conquest of Sind.' The suppression of piracy in particular was a crucial objective for the Muslim conquerors.
5. *Ibid.,* p. 181.
6. *Ibid.,* p. 52.
7. On Debal, see S. Q. Fatimi, 'The Twin Ports of Daybul' in H. Khuhro (ed.) *Sind Through the Centuries,* Karachi, 1981, pp. 97-105
8. Ibn Battuta, *Voyages*, translated from the Arabic by C. Defremery and B. R. Sanguinetti, Paris, 1854, p. 112. He calls 'Lahary' 'une belle place situee sur le rivage de l'ocean' and mentions that 'elle possede un grand port, ou abordent des gens du Yaman, du Fars'.
9. Wink, *Al Hind*, p. 173.
10. Allen, 'The Indian Merchant Community of Masqat'.
11. See S. Subrahmanyam, 'The Portuguese, Thatta and the External Trade of Sind, 1515-1635', *Revista de Cultura*, nos. 13-14, 1991, pp. 48-58.

12. See . S P. Chablani, *Economic Conditions in Sind 1592 to 1843*, Bombay, 1951, p. 52.
13. A. Hamilton, *A New Account of the East Indies*, London, 1744, quoted in A. Duarte, A History of British Relations with Sind, Karachi, 1976, p. 39.
14. Allen, 'The Indian Merchant Community of Masqat'.
15. See *A Forgotten Chapter of Indian History as Described in the Memoirs of Seth Naomal Hotchand, C. S. I. Of Karachi 1804-1878*, Karachi, 1982 (1st edn, Exeter, 1915) p. 36. These memoirs, which were written in Sindhi by Seth Naomal himself, were translated into English by his grandson, Rao Bahadur Alumal Trikamdas Bhojwani, and 'edited' by Sir H. Evan M. James, who was commissioner in Sind in 1891-9, and had them privately published. This document, in spite of having been translated and 'edited' is an extraordinary and in many ways unique source on the world of the Hindu banias of Sind.
16. M. Rodinson, *Islam et Capitalisme*, Paris, 1966.
17. See Dale, *Indian Merchants and Eurasian Trade*, p. 128.
18. J.J. L. Gommans, *The Rise of the Indo-Afghan Empire, 1710-1780*, Leiden, 1995.
19. See Allen, 'The Indian Merchant Community of Masqat'
20. See A. B. Advani, 'Hyderabad: a Brief Historical Sketch', *Sindhian world*, vol. 1, no. 6, 1940, pp. 356-69.
21. On the Malwa opium trade, see, for an overview, D. F. Owen, *British Opium Policy in China and India*, New Haven, CT, 1934, pp. 80-112, *Parliamentary Papers, House of Commons*, 1831-32, vol. VI, Appendices to the reports of the Committee on the East India Company affairs, Appendix IV, 'Abstract of correspondence regarding Malwa opium, commencing from the Year 1818 to the Year 1828', pp. 26-59, *Royal*

Commission on Opium, 1894-1895, vol. VII, *Final Report,* part II, *Historical Appendices,* London, 1895, 'Appendix B, Historical Memorandum, by R. M. Dane' pp. 28-63. For details of the route, see in particular IOR, Bengal Board of Revenue (Miscellaneous) Proceedings, Opium, Consultation 8A, 8 March 1824, enclosing letter from opim agent in Malwa to Board of Revenue, 17 February 1824, enclosing Memorandum respecting the export of opium to Pahlie and Demaun' and Consultation 18, 22 April 1824, from *ibid.*, enclosing information collected at Pali by a native informant.

22. Statistics bearing on opium exports to China from Daman between 1820-1and 1828-9 show widespread fluctuations, a peak being reached in 1827-8 with a quantity of almost 4,000 chests. See C. Pinto, *Trade and Finance in Portuguese India: a Study of the Portuguese Country Trade 1770-1840,* Delhi, 1994, Table 5.2, p. 132.
23. See J. Y. Wong, 'British Annexation of Sind in 1843; an Economic Perspective' *Modern Asian Studies,* vol. 31, no. 2, 1997, pp. 225-44. That some correlation existed between British opium policy on the one hand and the decision to annex Sind seems indubitable, but it does not prove that the desire to close the Sind route to Malwa opium was the main motive of the annexation.
24. See enclosure 8 B. 'Memorandum respecting the export of opium to Pahlie and Demaun' in opium agent in Malwa to Board of Revenue, Customs and Salt (Opium), 17 February 1824, Consultation no. 8 A, 9 March 1824, Bengal Board of Revenue (Miscellaneous) Proceedings, Opium, 9 March to 22 June 1824, and enclosure in ibid. to *ibid.*, 22 April 1824, Consultation no. 18, *ibid.*
25. Native agent in Sind to Colonel H. Pottinger, 27 November 1830, trans, by A. Burnes, assistant resident,

20 December 1830, Bombay Revenue Proceedings, December 1830, no. 135.

26. A Burnes, 'On the Commerce of Hyderabad and Lower Sind', in *Reports and Papers, Political, Geographical and Commercial Submitted to Government by Sir Alexander Burnes, Lieutenant Leech, Dr Lord and Lieutenant Wood Employed on Mission in the years 1835-36-37 in scinde, Afghanistan and Adjacent Countries,* Calcutta, 1839, p. 21.
27. In 1848, Captain Rathbone, the magistrate of Hyderabad, answering queries regarding trade in the Hyderabad Collectorate, stated: 'The Hyderabad merchants... had till within a year or two of the conquest a large opium trade across from Pali, which has been stopped under orders conveyed from the Supreme Government. Enclosed in minute of Sir George Clark, 24 April 1848. *Parliamentary Papers (House of Commons 1854, East India (Scinde)*, p. 293.
28. 'Report on the trade between Shikarpur and Marwar', *Reports and Papers, Commercial,* pp. 68-70. Leech gives the names of six Shikarpuri merchants engaged in the trade with a total capital of Rs 340,000 while he informs us that trade in the major commodities, assafoetida and saffron, is but a small share of what it was two decades earlier, one of the major reasons for the decline being the growing inroads of British goods in the markets of Rajputana.
29. See *Memoirs of Seth Naomal Hotchand,* pp. 41-5.
30. J. Burnes, *A Narrative of a Visit to the Court of Sinde,* Edinburgh, 1831, 2nd edn, (1st edn, Bombay, 1829), p. 76.
31. The mir is supposed to have exclaimed, in the face of evidence of treachery by a Hindu servant: 'You do not know the Hindus of Sinde; they are all blackguards and rascals'. *Ibid.,* p. 86.

32. F. B. Eastwick *A Glance at Sind before Napier or Dry Leaves from Young Egypt*, Karachi, 1973, reprint (1st edn, London, 1849), pp. 214-15.
33. *Memoirs of Seth Naomal*, p. 68.
34. See L. M. M. Thakurdas, 'Hindus and Talpurs of Sind', *Modern Review*, vol. 51, 1932, pp. 265-72.
35. See, however, B. M. Advani, *Sindh-je-Hindus-je-Tarikh* (History of Sindh Hindus) (in Sindhi) Hyderabad.
36. *Gazetteer of the Province of Sind,* compiled by E. H. Aitken, Karachi, 1907.
37. U.T. Thakur, *Sindhi Culture*, Bombay, 1959.
38. Calculated from Appendix A, 'Comparative Tables showing the number and distribution of various Hindu castes (1891 to 1931) in Sind' in *ibid.,* pp. 207-33.
39. For an interesting although controversial analysis of this question, centered on the Punjab, see H. Oberoi, *The Construction of Religious Boundaries: Culture, Identity and Diversity in the Sikh Tradition,* Delhi, 1994. To the best of my knowledge, no study has been done of the history of Sikhism in Sind.
40. According to the 1881 Census, there were in Sind 126, 976 Sikhs (including 68, 655 in Shikarpur distric and 42,940 in Hyderabad district) as against 305, 079 Hindus (93,341 in Shikarpur and 89, 114 in Hyderabad), suggesting that he majority of Lohanas in Shikarpur district and large minority in Hyderabad district returned themselves as Sikhs. *Census of India, 1881, Operations and Results in the Presidency of Bombay including Sind,* J. A. Baines, vol. II, Tables, Bombay, 1882, Table III, pp. 3-6. However, by the time of the 1891 Census, the situation had been totally reversed, as only 720 Sikhs were enumerated in the whole of Sind, as against 567,536 Hindus. *Census of India, 1891, vol. VIII, Bombay and its Feudatories, part II, Imperial Tables,* W. W. Drew, bombay, 1892, Table VI, pp. 26-7. Commenting on this puzzling change, the

census commissioner attributed it to the fact that in the 1891 Census 'religion' and 'sect' were distinct categories, but that only the former had been taken into account. He surmised that most of those who had previously enumerated themselves as Sikhs returned themselves in 1891 as of Hindu religion and Sikh sect, which explained that they figured under the heading 'Hindus'. *Census of India, 1891, vol. VIII, part I, Report*, W. W. Drew, Bombay, 1892, p. 40.

41. On Uderolal or Lal Udero, see 'Something about Lal Udero', in Sigma (Dayaram Gidumal) *Something about Sind,* Karachi, 1882, pp. 27-31.
42. On the role of the *sufi pirs* in Sindhi Islam, see S. F. D. Ansari, *Sufi Saints and State Power: the Pirs of Sind, 1843-1947,* Cambridge, 1992, pp. 19-35. Ansari mentions, p. 20, that Suhrawardi *sufis*, who were the first to be active in Sind, acquired Hindu followers 'in part as a result of the religious tolerance engendered by their belief in the doctrine of *wahdat-al-wujud'* (Unity of Being). Although this doctrine was later attacked by the Naqshbandis, *sufis* in Sind continued to accept Hindu disciples. The most influential of the *pirs,* the Pir Pagaro Sibghatullah Shah II (1921-43) systematically tried to win the trust of local Hindus by such gestures as the organization of a *shudhhi* ceremony for a Hindu who had converted to Islam and wished to be readmitted to his original faith. Mentioned in *ibid.,* pp. 137-8.
43. Hari P. Vaswani, in his biography of his father Sadhu T.L. Vaswani, who was the main spiritual guide of Sindhi Hindus in the twentieth century, mentions that 'Hindus in Sind participated in the Muharram, the festival of the Muslims. They considered the *tabut* to be so very holy that they brought their new-born babes to it to be blessed. They also covered the *tabut* with their

kerchiefs as a mark of respect and reverence.' H.P. Vaswani, *A Saint of Modern India,* Poona, 1975, p. 4.

44. See N. Boreham, 'Decolonisation and Provincial Muslim Politics: Sindh, 1937-47', *South Asia, new series,* vol. 16, no.1, 1993, pp. 53-72.
45. See S. Anand, *National Integration of Sindhis,* Delhi, 1996, in particular ch. 2, 'Partition and Mass Exodus', pp. 22-60.
46. The most significant episode of communal violence in Sind occurred in 1939 around the so-called Manzilgah agitation in Sukkur. See H. Khuhro, 'Masjid Manzilgah, 1939-40: Test Case for Hindu-Muslim Relations in Sind', *Modern Asian Studies*, vol. 32, no.1, 1998, pp. 49-89
47. R. F. Burton, *Sindh and the Races that Inhabit the Valley of the Indus, with Notices of the Topography and History of the Province,* London, 1851, in particular chapter 12, 'The Hindoos of Sindh', pp. 309-37.
48. R. F. Burton, *Sindh Revisited,* London, 1877, in Particular vol. I, chapter 14, significantly entitled 'The Hindus of Sind- their Rascality and their Philoprogenitiveness', pp.269-95, from where I extract this passage about the *banias*, pp. 283-4: 'he then takes his place in the shop, where, if you please, we shall leave him to cheat and haggle, to spoil and adulterate, and to become as speedily rich by the practice of as much conventional and commercial rascality, barely within the limits of actual felony, as he can pass off upon the world'.
49. See R. D. Choksey, *The Story of Sind (An Economic Survey), 1843-1933*, Poona, 1983, pp. 130-1.
50. D. Cheesman, *Landlord Power and Rural Indebtedness in Colonial Sind 1865-1901*, London, 1997. See also H. Khuhro, *The Making of Modern Sind: British Policy and Social Change in the Nineteenth Century,* Karachi, 1978.

51. See N. Bhattacharya, 'Lenders and Debtors: Punjab Countryside, 1880-1940', *Studies in History*, new series, vol. 1, no. 2, 1985, pp. 305-42.
52. See Cheesman, *Landlord Power,* p. 164.
53. For some instances, see *ibid.,* pp. 186-8.
54. According to the *Gazetteer of the Province of Sind*, p. 331, the average price of bajra, the staple grain crop in Sind, went up from Rs 1-1-10 per maund during 1844-50 to Rs 2-7-0 in 1896-1905.
55. On the growth of the port of Karachi and its connections with the Punjab, see A. F. Baillie, *Kurrachee (Karachi), Past, Present and Future,* London, 1890, and I. Banga, 'Karachi and its Hinterland under Colonial Rule', in I. Banga (ed.), *Ports and their Hinterlands in India (1700-1950)*, Delhi, 1992, pp. 337-58.
56. In the second half of the nineteenth century it was Bombay revenue which largely paid for the construction of a port which served primarily the Punjab. For Punjab finances it was a very good operation, and it explains why Punjab officials were never particularly keen to have Sind become part of their province. In 1903, when Sir Denzil Ibbetson, having been made lieutenant-governor of the Punjab, tried to have his domain (which had been diminished by the separation of the North-West Frontier Province in 1901) increased by the inclusion of Sind, Lord Curzon, whose grasp of interprovincial financial transfers was better than Ibbetson's quashed his attempt. See P. Mahto, 'The Separation of Sind from Bombay Presidency' in M. Y. Mughul (ed.), *Studies in Sind,* Jamshoro, 1989.
57. See H. Feldman, *One Hunderd Years of Karachi,* Kharachi 1960.
58. On the Parsis in Karachi, see T. R. Metcalf and S. B. Freitag, 'Karachi's Early Merchant Families:

entrepreneurship and community', in D. K. Basu, *The Rise and Growth of the Colonial Port Cities in Asia,* Berkeley, CA, 1985, pp. 55-9.

59. On the role of the Shikarpuris in Karachi, see Banga, 'Karachi and its Hinterland's pp. 357-8: 'The Shikarpuri Banias... migrated to Karachi to take over its grain and cotton trade as brokers which placed them in a position of dominance in the commodity export trade... Their firms of bhaibands played an important role in the Buyers and Shippers Chamber- and organization of firms engaged in maritime trade. They dominated the Karachi Indian Merchants Association founded in 1902 and played an important role in the Karachi Cotton Association founded in 1933.



سندھی ومہاجر شناخت۔ تضادات واشتراک

تاریخ میں قومیں آپس میں برسرپیکار رہی ہیں۔ ان میں سیاسی تصادم کے ساتھ ساتھ' معاشی وسماجی طور پر بھی کشمکش رہی ہے۔ جب قومیں آپس میں متصادم ہوئی ہیں تو اس کی دو شکلیں رہی ہیں۔ ایک تو قوم فاتح کی شکل میں آتی ہے جب وہ فوجی طاقت وقوت سے دوسری قوم کو شکست دے کر اپنا مفتوح بنالیتی ہے۔ اس صورت میں اکثر اس کے تاریخی ورثہ کو ختم کرکے' اپنی بالادستی قائم کرتی ہے اور اپنا کلچر اور زبان کو اس پر مسلط کرتی ہے۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنی سیاسی بالادستی کے باوجود وہ مفتوح کلچر سے سیکھتی بھی ہے اور اس کے کچھ اثرات کو قبول بھی کرتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک بڑی تعداد ترک وطن کر کے دوسرے علاقے میں جاتی ہے۔ اس صورت میں بھی نئے آنے والوں اور قدیم باشندوں میں تصادم ہوتا ہے۔ لیکن وقت کی ضرورت اور تقاضوں کے تحت ان میں اشتراک کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے ملاپ سے ایک مشترکہ کلچر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں بھی ہم دو صورتوں کو دیکھتے ہیں۔ اگر مقامی آبادی کلچر کے لحاظ سے کمزور ہوتی ہے تو اس صورت میں اسے ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کے کلچر کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں تو اس صورت میں اسے مساوی یا غیر مساوی طور پر شریک کر لیا جاتا ہے۔

تاریخ میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں آریاؤں کی آمد۔ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آریہ ہندوستان پر حملہ آور نہیں ہوئے تھے بلکہ مختلف وقتوں میں گروہوں اور جماعتوں کی صورت میں ہجرت کر کے آئے تھے۔ لہٰذا ان آنے والوں اور یہاں کے مقامی باشندوں یعنی دراوڑوں میں جنگیں بھی ہوئیں' سماجی ومعاشی طور پر تصادم بھی ہوا' مگر اس کے ساتھ

ہی آہستہ روی کے ساتھ ان دونوں میں ثقافتی اشتراک بھی ہوا' جس کے نتیجہ میں دراوڑی روایات اس تہذیب کا حصہ بن گئی کہ جو اب ویدوں کی تہذیب کہلاتی ہے۔ اب تک تصور یہی تھا کہ آریاؤں نے دراوڑوں کو جنوب میں دھکیل دیا اور خود مکمل طور پر ہندوستان پر قابض ہو گئے' مگر اب تحقیق کے ذریعہ ان دراوڑی عناصر کی نشاندہی کی جا رہی ہے جنہوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب کی تشکیل میں حصہ لیا۔

دوسری مثال ہمارے سامنے یورپی اقوام کی ہے کہ جنہوں نے امریکہ' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ پر قبضے کیے اور وہاں کی مقامی آبادی کو ان کی زمینوں سے محروم کر کے انہیں ''محفوظ علاقوں'' میں منتقل کر دیا۔ یہ عمل بھی پرامن طریقہ سے نہیں ہوا بلکہ اس میں تشدد مزاحمت اور قتل و غارت گری جاری رہی یہاں تک کہ مقامی آبادی گھٹ گئی اور ان کی مزاحمت کی قوت ختم ہو گئی۔ ان ملکوں میں یورپی تہذیب نے بالادستی حاصل کر کے مقامی تہذیب اور کلچر کو تقریباً ختم کر دیا اور شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ مقامی لوگوں کو یورپی تہذیب میں ضم کر دیا جائے۔

اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہندوستانی تاریخ میں مسلمان حملہ آوروں کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سندھ اور شمالی ہندوستان میں جو مسلمان فاتحین آئے' انہوں نے اپنے کلچر کی بالادستی تو قائم رکھی' مگر مقامی کلچر کو ختم نہیں کر سکے کیونکہ اس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ جنوبی ہندوستان کے جہاں وہ بطور تاجر کے آئے وہاں انہوں نے مقامی کلچر کو اختیار کر کے خود کو اس میں ضم کر لیا۔ اس لیے فاتحین' تاجر یا سیاسی و معاشی اور ثقافتی مہاجروں کی ذہنیت میں فرق ہوتا ہے۔ فاتحین اپنی قوت و طاقت کی وجہ سے خود کو بالاتر سمجھتا ہے' جبکہ رضا کارانہ یا دباؤ کے تحت آنے والے' ذہنی طور پر مقامی کلچر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

اب ہم تقسیم کے بعد اس تاریخی عمل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے کہ جو ہندوستان سے مہاجرین کی آمد کی شکل میں سندھ میں ہوا۔ اگرچہ یہ آنے والے فاتحین نہیں تھے' بلکہ ان میں سے اکثر سیاسی فسادات کے نتیجہ میں یا ملازمت کی غرض سے آئے تھے۔ مگر ان میں وہ راہنما بھی شامل تھے کہ جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کا وجود ان کی تحریکوں اور کوششوں کی وجہ سے عمل میں آیا ہے۔ اس لیے اس ملک پر ان کا حق ہے۔ یہ ایک فاتحانہ ذہنیت تھی کہ جس کا اظہار بیوروکریسی' فوج اور انتظامیہ کے عہدیداران کی جانب سے ہوا۔

چونکہ نئے آنے والے اپنے ساتھ روایات و اقدار اور ساتھ ہی میں اپنے وطن کی یادیں بھی

لائے‘ اس لیے ان میں ثقافتی برتری کا احساس بھی تھا۔ کیونکہ سندھ کے شہروں سے ہندو تعلیم یافتہ طبقہ آہستہ آہستہ جا چکا تھا اور ان کے مقابلے میں سندھ کا دیہاتی کلچر تھا کہ جس پر وڈیروں کا تسلط تھا۔ لہٰذا شہروں کی آبادی میں نئے آنے والوں کی اکثریت ہو گئی۔ انہوں نے جلد ہی شہر کی شکل و صورت بدل ڈالی۔ محلوں‘ شاہراہوں اور عمارتوں کے نام وہ رکھے گئے کہ جن کا سندھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سندھ کے شہر‘ سندھ کے لوگوں کے لیے اجنبی ہو گئے۔

اس نئی صورت حال نے سندھ کے مقامی باشندوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا۔ ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا منطقی تھا کہ کیا انہیں ''ریڈ انڈینز'' بنا کر محفوظ علاقوں میں تو نہیں دھکیل دیا جائے گا۔ اس ردعمل کے نتیجہ میں سندھ میں نیشنل ازم ابھرا جس کی بنیاد کلچر پر تھی‘ اور جس کا اہم عنصر سندھی زبان تھی۔ اس نیشنل ازم کا ایک پہلو جارحانہ بھی تھا۔ یہ کسی بھی قسم کے اشتراک پر تیار نہیں تھا اور خود کو سب سے علیحدہ رکھنے پر مصر تھا۔ یہ اپنی سندھی شناخت کو دوسری اتھنک شناختوں پر ترجیح دیتا تھا۔ یہ اس پر تیار نہیں تھا کہ نئے آنے والوں کو اپنے میں شامل کرے۔ وہ نیشنل ازم کہ جس کی بنیاد کلچر بھی ہوتی ہے‘ وہ دوسری کلچرل عناصر کو اس لیے شامل نہیں کرتے ہیں کہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں کلچر کی خالصیت ملاوٹ سے کمزور نہ ہو جائے۔

سندھی اور مہاجر تضاد نے سندھ کے معاشرے کی ساخت کو بدل کر رکھ دیا۔ اس تبدیلی کا اظہار شہر اور دیہات کے درمیان فرق کی صورت میں ابھرا۔ شہر کے رہنے والے اگر ترقی کی علامت تھے تو دیہات والے پس ماندگی کی۔ (آگے چل کر کوٹہ سسٹم اور دیہات کے لوگوں کی مخصوص مراعات نے اس فرق کو اور زیادہ واضح کر دیا) لیکن آج ہم جسے مہاجر کمیونٹی کہتے ہیں ابتدائی دور میں یہ ان بکھرے ہوئے لوگوں کا نام تھا کہ جو یوپی‘ بہار‘ راجستھان اور حیدر آباد دکن سے آئے تھے۔ ثقافتی طور پر بھی یہ ایک دوسرے سے جدا تھے۔ ان کی زبان کا لہجہ بھی مختلف تھا۔ ان میں علاقائی طور پر ایک دوسرے کے خلاف تعصبات بھی تھے۔ پاکستان آنے والوں نے اپنی شناخت مہاجر نہیں بلکہ پاکستانی قرار دی تھی۔ کیونکہ وہ نئے ملک میں اس شناخت کو حاصل کرنے اور اسے پختہ کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ اس شناخت کی اہمیت یہ تھی کہ اس کے ساتھ وہ پاکستان کے کسی بھی صوبہ میں آباد ہو سکتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ تمام صوبوں کے لوگ صوبائی شناخت ختم کر کے اس قومی شناخت کو تسلیم کر لیں تاکہ ان میں اور مقامی لوگوں میں کوئی فرق نہ رہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس ابتدائی دور میں صوبائی شناخت کو صوبائی تعصب کہہ کر اس کی نفی کی

گئی۔

اس کے ساتھ ہی جب ہم سندھی معاشرے کا تجزیہ کرتے ہیں۔ تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تقسیم سے پہلے وہ بھی کوئی متحدہ معاشرہ نہیں تھا۔ اس میں بھی سندھی اور بلوچوں میں اتھنک فرق موجود تھا۔ سندھ پر حکومت کرنے کی وجہ سے بلوچوں نے سندھ میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا' قبائلی معاشرہ کی وجہ سے ان میں قبائلی اختلافات اور تضادات بھی تھے۔

1950ء کی دہائی سے سندھی اور مہاجر کمیونٹیز میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ ون یونٹ (1955) کے بعد سے سندھ میں نیشنل ازم کی تحریک ابھری جس نے سندھ کے بکھرے گروپوں اور جماعتوں کو ایک وحدت میں تبدیل کرنا شروع کیا۔ نیشنل ازم کی بنیاد کلچر پر تھی' لہٰذا اس عمل میں سندھی اور بلوچ ایک ہو گئے۔ اس تحریک کو سب سے زیادہ تقویت ادیبوں نے دی۔ لہٰذا قوم کی تشکیل کے جو مرحلے ہیں' ان میں سب سے پہلے پڑھے لکھے لوگ آتے ہیں' اس کے بعد یہ جذبہ عام لوگوں میں پھیلتا ہے۔ سندھی زبان نے ان تمام مختلف الخیال لوگوں کو آپس میں ملا دیا۔

سندھ میں آنے والے مہاجرین بھی اس عمل سے گزرے۔ انہوں نے بھی اپنی شناخت کی بنیاد زبان پر رکھی' لہٰذا ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے اس زبان کی بنیاد پر ایک وحدت بن گئے۔ یہاں تک کہ گجراتی بولنے والے جواب تک سیاست سے دور تھے' وہ بھی مہاجر کمیونٹی کا ایک حصہ بن گئے۔

سندھی اور مہاجر کمیونٹیز کی اس تشکیل میں دو عناصر نے اہم کردار ادا کیا۔ ایک عدم تحفظ کا جو دونوں کمیونٹیز میں شدت کے ساتھ ابھرا۔ سندھیوں میں یہ احساس مہاجرین کی موجودگی سے ہوا' تو مہاجرین میں اس وجہ سے کہ وہ صوبائی شناخت کے بعد ''غیر ملکی اور بغیر کسی وطن'' کے ہو گئے۔ اگر انہیں قبول نہیں کیا گیا تو وہ کہاں جائیں گے۔ دوسرے 1980ء کی دہائی سے ہونے والے فسادات تھے کہ تشدد' دہشت گردی اور خوف و ڈر نے دونوں کمیونٹیز میں طبقاتی اختلافات کو ختم کر کے انہیں ایک دوسرے کے خلاف متحد کر دیا۔

اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جانب سے پاکستانی شناخت کمزور ہو گئی۔ اس کی جگہ سندھی اور مہاجر شناخت نے لی۔ ان شناختوں کو پختہ کرنے کے لیے دونوں جانب سے تاریخ کا سہارا لیا گیا اور ایک ایسے ماضی کی تشکیل کی گئی کہ جو ان کی شناختوں کو ابھارے اور انہیں تاریخی جواز فراہم

کرے۔ سندھی شناخت نے اپنی جڑیں وادی سندھ کی تہذیب سے تروع کیں۔ تاریخ کی اس تشکیل میں ان کے ہاں ہیروز بھی ہیں تو غدار بھی۔ ہیرو غدار کا یہ ذکر اس لیے اہم ہوتا ہے کہ ہر سیاسی تحریک اس کے ذریعہ سے یہ پیغام دیتی ہے کہ جو اس کے ساتھ رہے اور قربانی دی انہیں تاریخ یاد کرے گی' مگر جو اس سے غداری کریں گے انہیں تاریخ معاف نہیں کرے گی۔ تاریخ کی یہ تشکیل کارکنوں کو حوصلہ دیتی ہے کہ وہ تحریک کو کامیاب بنائیں' اوران کو وارننگ دیتی ہے کہ جو اس سے علیحدہ ہیں یا اس کے مفاد سے جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ تاریخ کی اس تشکیل میں کلچر کو اہمیت رہی۔ ادب' موسیقی' تعمیرات' لباس اور زبان اس کے عناصر رہے۔ مثلاً لباس کے سلسلہ میں اجرک اور سندھ ٹوپی (جو کہ بلوچی ہے) اہم علامتیں بن کر ابھریں۔

اس کے مقابلہ میں مہاجر شناخت تقسیم ہند کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ ان کا ماضی قدیم تاریخ سے تشکیل نہیں دیا گیا۔ بلکہ اس کی ابتداء تحریک پاکستان سے ہوتی' جو فسادات کے نتیجہ میں پختگی کو پہنچی۔ اردو زبان و ادب کا سرمایہ ان کا ثقافتی ورثہ ہے۔ لہٰذا ان کی شناخت کی بنیاد بیرونی عناصر پر ہے۔ اگرچہ انہوں نے ''مہاجر'' ہونے کو بطور مذہبی علامت اختیار کرنے کی کوشش کی' اور اسلامی تاریخ سے مہاجرین مکہ کی مثال کو پیش کیا۔ اس میں ایک اشتراک کا پہلو بھی تھا کہ جب وہ اہل سندھ کو ''انصار'' سے تشبیہ دے کر ان کی مدد کا اعتراف کرتے تھے۔ دونوں کمیونٹیز کی جانب سے جس ماضی کی تشکیل ہوئی۔ اس میں تاریخ بٹی ہوئی ہے۔ دونوں کا تاریخی ورثہ انہیں علیحدہ علیحدہ راستوں پر لے جاتا ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ان دو تاریخی ورثوں کو آپس میں جوڑ دیا جائے تاکہ یہ ان دونوں کے تضادات کو دور کر سکیں؟

مہاجر کمیونٹی میں تبدیلی آئی ہے۔ ان کی نئی نسلیں نہ تو اب اپنے آباؤ اجداد کے علاقوں سے واقف ہیں اور نہ ہی ان میں ناسٹلجیا ہے۔ انہوں نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے وہ سندھ کا ہے' لہٰذا ان کی خواہش ہے کہ ان شناخت کو سندھی تسلیم کر لیا جائے۔

ان دو شناختوں کے ملاپ میں ادب اور تاریخ اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اردو ادب میں سندھ شناسی کے سلسلہ میں جو تراجم سندھی سے اردو میں ہوئے ہیں انہوں نے سندھ کے بارے میں آگہی کو پیدا کیا ہے۔ اس عمل میں اردو زبان بھی متاثر ہوئی ہے کہ جس میں کئی سندھی الفاظ مستعمل ہونے لگے ہیں۔ جو کہ کلچرل اشتراک کی طرف ایک قدم ہے۔

دوسرا اہم ذریعہ تاریخ ہے۔ اردو داں طبقے میں سندھ کی تاریخ سے دلچسپی تقسیم سے پہلے بھی

موجود تھے۔ عبدالحلیم شرر اور ابوظفر ندوی نے سندھی تاریخیں لکھ کر اردو داں طبقے کو سندھ سے روشناس کرایا تھا۔ تقسیم کے بعد بھی سندھ کی تاریخ اور کلچر پر اردو میں کام ہوا ہے۔ یہ تحریریں روایتی ہیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ سندھ کی ایک ایسی تاریخ مرتب کی جائے کہ جو دونوں کمیونٹیز کے رشتہ کو آپس میں جوڑ سکے۔

اس سلسلہ میں ایک بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ دانشور اپنی تحریروں کے ذریعہ آگہی و شعور تو پیدا کر سکتے ہیں مگر اس کے لیے لازمی ہوتا ہے کہ سیاسی و معاشی قوتیں بھی اس کا ساتھ دیں۔ اس وقت شہری اور دیہاتی کلچر نے تضاد کو برقرار رکھا ہے۔ سندھی اور مہاجر شناخت نے طبقاتی فرق کو کمزور کر دیا ہے۔ اس لیے جب تک شہری و دیہاتی کلچر کا فرق دور نہ ہوگا اور طبقاتی شعور نہیں بڑھے گا' اس وقت تک تضادات باقی رہیں گے اور سندھی و مہاجر شناخت کے نام پر بااثر اور طبقہ اعلیٰ کے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔



وادی سندھ کی تہذیب

معاشرت

(یہ مضمون محمد ادریس صدیقی کی کتاب "وادی سندھ کی تہذیب" (1959) سے لیا گیا ہے)

مشرق قریب اور بالخصوص مصر کے قدیم باشندے جب اپنے مردوں کو سپرد خاک کرتے تھے تو ان کے ساتھ ہی کافی سامان زاد راہ آخرت کے طور پر دفن کر دیا کرتے تھے ماہرین آثار کو اس سامان کے ملنے سے ان لوگوں کے طرز زندگی کا اندازہ لگانے میں بڑی آسانی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کی معاشرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے مثلاً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا لباس کیسا ہوا کرتا تھا' ان میں آرائش اور زیبائش کا کس نوعیت کا اور کس قدر ذوق تھا' ان کا مذہب کیا تھا اور ان کے اعتقادات کی نوعیت کیا تھی۔ اس زاد راہ آخرت کے علاوہ ان مقبروں کی دیواروں پر تصویر کشی کے ساتھ قدیم رسم الخط میں مختلف عبارتیں بھی کندہ کی گئی ہیں۔ جس سے اس عہد کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ ان مقبروں سے دریافت شدہ باقیات اور ان کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویروں سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ وہاں کے امراء اور سلاطین کی زندگی عوام سے بہت مختلف اور ممتاز تھی اور وہاں چھوٹے بڑے اعلیٰ و ادنیٰ اور حاکم و محکوم میں بہت نمایاں فرق تھا۔

وادی سندھ کے قدیم باشندوں نے نہ تو مقبرے چھوڑے ہیں نہ مقبروں پر بنی ہوئی تصویریں نہ ہی اب تک یہاں کی تحریریں ہی پڑھی جا سکی ہیں۔ یہاں مردوں یا زندوں سے متعلق ایسے نقوش جن کی مصر میں کثرت ہے دریافت نہیں ہوئے گویا یہاں موت و حیات کے درمیان بڑا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود یہاں

عالیشان مقبروں کی غیر موجودگی اور دریافت شدہ چند قبروں کی تعمیر میں کسی غیر معمولی اہتمام کا فقدان ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہاں کا عام آدمی اپنے ہمعصروں میں آزادی اور ضروریات زندگی کی فراہمی میں نسبتاً مساوی حقوق کا مالک تھا۔ اور شاید یہاں کے سماج میں تکلیف دہ طبقاتی ناہمواریاں نہ تھیں بلکہ یہاں کے باشندے اطمینان آسائش اور فراغت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ سماج نے کچھ قاعدے اور قوانین مقرر کئے تھے جن کی پابندی سب پر فرض تھی۔ یہاں ایک منظم اور معقول بلدیاتی نظام رائج تھا اور اس سلسلے میں شہر کو صاف رکھنے صفائی کی آسانی بہم پہنچانے حفظان صحت کے اصولوں کو مدنظر رکھنے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ مختلف مکانوں کی نگہ داشت کے لئے چوکیداری کا انتظام' بڑے بڑے کاروانسرائے' رفاہ عام کے گودام' عوامی کنویں' تولنے اور ناپنے کے مختلف اور متوازن پیمانے ایک منظم سماجی زندگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ موہنجوداڑو میں شہر کے انتظامی معاملات میں موریہ عہد کے شورائی نظام یا گپتا عہد کی شہری کونسلی نظام کے اثرات ضرور موجود ہوں گے اور ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ اگر موہنجوداڑو میں اشرافیہ یا عددیہ برسراقتدار تھی تو یقیناً یہ تجارتی عددیہ رہی ہو گی۔

بلدیاتی نظام

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ گپتا عہد میں سب سے بڑے تاجر کے علاوہ جو ناظم بلدیہ بھی ہوا کرتا تھا کاروانی تجارت کے نمائندوں اہل حرفہ کے نمائندوں' اور اہل علم کا سماج میں خاص مقام ہوا کرتا تھا۔ موہنجوداڑو میں بھی اس قسم کے نظام کی موجودگی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ کیونکہ ہم اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ اس کی خوشحالی کا موجب اس کی داخلی اور خارجی تجارت تھی۔ دریائے سندھ کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے یہاں کشتیوں کے ذریعہ نہ صرف اندرون ملک سے ہی سامان آتا رہا ہو گا بلکہ مستولوں والی سمندری کشتیوں کے ذریعہ دوسرے ملکوں سے بھی تجارت ہوتی ہو گی۔ اس کے علاوہ بلوچستان کے درون کے ذریعے یہ علاقہ ایران اور مشرق قریب کے دوسرے ملکوں سے خشکی کے راستوں سے بھی ملا ہوا تھا۔ اسی طرح کاٹھیاوار جنوبی

ہندوستان اور دوسرے علاقوں سے یہاں تجارتی مال لانے والے قافلے آتے تھے۔ گویا کراچی کی طرح موہنجوداڑو بھی ایک بین الاقوامی نوعیت کا شہر تھا جس کا مزید ثبوت ان مختلف قوموں اور نسلوں کے ڈھانچوں اور کھوپڑیوں سے ملتا ہے جن کے مالکوں نے اس سرزمین میں اقامت اختیار کی اور بالاخر یہیں مرے۔ اس کے برعکس مصر کے مقبروں میں ایک ہی نسل کے لوگوں کے ڈھانچے ملے ہیں۔ وادی سندھ کی تجارت اور دولت کے فروغ اور امن اور فراغت کی موجب یہی مختلف قومیں تھیں جنھوں نے اس کی ترقی کو چار چاند لگائے لیکن دور انحطاط میں یہ مختلف النسل آبادی اس تہذیب کی بربادی کا موجب بنی۔

زراعت و خوراک

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے موہنجوداڑو تجارت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ تجارتی منڈیاں اجاڑ اور بنجر علاقوں میں نہیں بنا کرتیں کیونکہ ان کی کثیر آبادی کی خوراک کے لئے نواح میں غلہ اور دوسری اشیائے خورد و نوش کی پیداوار لازمی ہے۔ چنانچہ موہنجوداڑو کے ابتدائی باشندے جب کبھی بلوچستان یا کسی دوسرے علاقے کی پہاڑیوں سے آئے ہوں گے تو انھوں نے وادی سندھ کی زرخیز اور سرسبز و شاداب سرزمین کی آغوش میں بڑی عافیت محسوس کی ہو گی۔ اور اس وقت اس کے دامن میں لہلہاتے ہوئے کھیت اور سونا اگلنے والی زمین اس تہذیب کے آغاز کا موجب بنی ہو گی۔ لیکن دریائے سندھ کی لائی ہوئی مٹی اور ریت کی تہوں نے ان ابتدائی کھیتوں اور آب رسانی کے انتظامات کے تمام نشانات مٹا دیئے ہیں اور اب ہم یہاں کی قدیم کاشتکاری اور فصلوں کا اندازہ دریافت شدہ باقیات سے ہی لگا سکتے ہیں یہاں گیہوں اور جو کے ایسے جلے ہوئے دانے ملے ہیں جو خود رو نہیں ہیں بلکہ اسی قسم کا گیہوں آج بھی پاکستان میں اگایا جاتا ہے۔ ایسا ہی جو مصر کے قدیم حکمرانوں کی قبروں میں بھی دستیاب ہوا ہے۔ یہ غلہ پتھر کی چپٹی یا گھوڑے کی زین جیسی شکل والی سلوں پر پیسا جاتا تھا کیونکہ اس وقت تک آٹا پیسنے والی دو پاٹ کی گول چکی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ پیسنے سے پہلے لکڑیوں کی بنی ہوئی

او کھلیوں میں غلہ کی بھوسی دور کی جاتی تھی۔

ہڑپہ میں مٹر کے جلے ہوئے دانے تربوز کے بیج اور تل دریافت ہوئے ہیں۔ موہنجوداڑو میں کھجور کی چند گٹھلیاں بھی ملی ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ خلیج فارس سے در آمد کی گئی ہوں۔ اسی طرح ہڑپہ سے دریافت شدہ ایک مہر پر ایک ایسی تصویر بنائی گئی ہے جس پر ناریل کے درخت کا گمان ہوتا ہے وادی سندھ میں اس درخت کے وجود کا ثبوت اس برتن سے بھی ملتا ہے جو اس کے سخت چھلکے کا بنا ہوا ہے۔ اسی طرح ایک مہر پر بنی ہوئی ایک تصویر پر انار کے درخت ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔

یہاں گیہوں اور جو کے علاوہ چاول اور دالیں بھی اوگائی جاتی ہوں گی اور ان کے ساتھ ساتھ ترکاریاں بھی زاید فصل کی حیثیت سے بوئی جاتی ہوں گی۔ دودھ کی فراوانی گائے اور بکری کی موجودگی سے ظاہر ہے۔ غلہ اور ترکاریوں کے علاوہ جانوروں کا گوشت بھی کھایا جاتا ہو گا۔ کیونکہ یہاں کی گلیوں' سڑکوں اور مکانوں میں گائے بیل بھینسے بکری دریائی اور سمندری مچھلی گھڑیال اور کچھوے کی لاتعداد ہڈیاں ملی ہیں۔

لباس

وادی سندھ کی سب سے اہم دریافت روئی کے بنے ہوئے کپڑے کا وہ ٹکڑا ہے جو تانبے اور چاندی کے ظروف کے ہمراہ پایا گیا ہے۔ یہ روئی کی قدیم ترین دریافت ہے۔ کیونکہ مصر جہاں آج کافی مقدار میں روئی پیدا ہوتی ہے پرانے زمانے میں روئی سے محروم تھا۔ روئی کے لئے سنسکرت میں لفظ "سندھو" مستعمل ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روئی عہد قدیم میں سندھ ہی میں پیدا ہوتی تھی اس طرح بابلی زبان میں روئی کے لئے لفظ سندھو اور یونانی زبان میں لفظ "سنڈن" بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ روئی سندھ سے ان ممالک میں خام پیداوار اور کپڑے کی شکل میں برآمد کی جاتی ہو گی۔ کپاس کے علاوہ کالی تلسی کا ریشہ بھی کپڑے بنانے کے کام آتا تھا کیونکہ مچھلی پکڑنے کے ایک کانٹے پر اس قسم کا دھاگا لپٹا ہوا پایا گیا تھا جو اس کے ریشوں سے بنایا گیا تھا۔

کپڑا زیادہ دنوں تک زیر زمین دفن رہنے پر دیمک اور دوسرے کیڑے مکوڑوں اور زمین کے کھار کی نظر ہو جاتا ہے چنانچہ وادی سندھ میں اوپر بیان کئے ہوئے ٹکڑے کے علاوہ کوئی اور کپڑا دریافت نہیں ہوا ہے۔ لیکن تقریباً ہر گھر سے سوت کاتنے کی تکلیاں برآمد ہوئی ہیں۔ یہ تکلیاں قیمتی اشیاء سے لے کر مٹی اور گھونگھے تک کی ہیں۔ جس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ امیر و غریب سب فرصت کے اوقات میں سوت کاتا کرتے تھے۔ یہاں مختلف نسلوں کے لوگ رہا کرتے تھے۔ اور خیال ہے کہ ان کے لباس بھی مختلف رہے ہوں گے مگر ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی باقیات اس سلسلے میں ہماری زیادہ مدد نہیں کرتیں صرف چند مجسمے اور برتنوں پر بنے ہوئے نقوش ہی یہاں کے باشندوں کے طریق لباس کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ لباس کی ترتیب ڈیزائن سے یہ لوگ بیگانہ نہ تھے بالخصوص نسوانی مجسمے اس قسم کے مطالعہ کے لئے زیادہ مفید ہیں جن سے لباس کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں مثلاً عورتیں عام طریقے پر ایک زیر جامعہ (تہ بند کی قسم کی چیز) پہنتی تھیں جس کو کمر پر منکے پروئی ہوئی کردھنی یا بٹی ہوئی ڈور یا کمربند سے اس طرح باندھتی تھیں کہ سامنے کی طرف بروچ یا پھندے کی شکل بن جاتی تھی۔ یہ زیر جامے گھٹنے کے اوپر ہی ختم ہو جاتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عورتیں ناف سے اوپر کوئی کپڑا ہی نہ پہنتی تھیں جیسا کہ انڈونیشیا میں جزیرہ بالی میں ایک خاص قوم کی عورتیں آج بھی ناف سے اوپر کوئی کپڑا پہنا معیوب سمجھتی ہیں۔ مٹی کی ایسی لاتعداد نسوانی مورتیاں ملی ہیں جن کے جسم کے اوپر کوئی کپڑا نہیں البتہ ان کے گلے اور سینے پر لاتعداد ہار اور مالائیں پڑی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ان کے ہاتھ میں لاتعداد چوڑیاں ہیں لیکن یہ مورتیاں مادر ارض کا مجسمہ ہیں جن کی تقدیس سترپوشی اور عریانیت کی قید و بند سے آزاد سمجھی جاتی ہوگی۔ اس کے علاوہ کانسے کے بالکل عریاں مجسمے ملے ہیں جن کو رقاصاؤں کا مجسمہ کہا گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ قدیم مصر کی رقاصاؤں کی طرح بعض رقصوں میں وادی سندھ کی رقاصائیں رقص کے وقت برہنہ رہتی ہوں۔ لیکن ان مجسموں کی روشنی میں یہاں کی عورتوں کی نیم عریانیت یا عریانیت کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

عورتوں کے مجسموں اور مہروں پر بنی ہوئی تصویروں کے سر پر پنکھے کی شکل کی ایک پوشش بھی نظر آتی ہے لیکن ابھی تک اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا کہ یہ کس چیز کا بنایا جاتا تھا قیاس ہے کہ سوتی کپڑے کو کلف دے کر کسی سانچے پر منڈھ دیا جاتا ہو گا اسی طرح اکثر مجسموں کے دونوں کانوں کے پاس دو کٹوریاں جیسی لگائی گئی ہیں جو کافی وزنی ہوتی تھیں کیونکہ بعض بعض مجسموں میں ان کو سر سے اٹکا کر ان کی گرانباری کم کی گئی ہے۔ (پلیٹ نمبر 18- الف) سر والی پنکھے کی شکل کی پوشش ہم کو مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے لیکن منگولیا کی چند قومیں آج بھی ایسی پوشش استعمال کرتی ہیں۔

مرد معمولی کپڑے پہنتے تھے رؤسا سوزن کاری کئے ہوئے نقش و نگار اور بیل بوٹے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتے تھے۔ لیکن عام پوشاک کے بارے میں اندازہ لگانا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ بعض مجسمے تو بالکل برہنہ ہیں اور بعض میں ستر پوشی کے لئے ایک پتلی پٹی سی نظر آتی ہے۔ بعض مجسموں سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک سادی یا سوزن کاری کی ہوئی چادر اس طرح اوڑھی جاتی تھی کہ بایاں بازو ڈھانکے ہوئے دائیں ہاتھ کی بغل سے گزر کر پیٹھ کی طرف مڑ جاتی تھی اس طرح سے دایاں بازو بالکل آزاد رہتا تھا۔ ایک مجسمے میں بالکل ایسی ہی چادر گھٹنے تک لٹکتی دکھائی گئی ہے آج بھی ہندوستان میں پرانی وضع کے لوگ اسی طرح چادر لپیٹتے ہیں اور یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ یجروید میں اس طرح چادر پہننے کے طریقے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس کو یوپاویتا کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مہاتما گوتم بدھ کے پتھروں کے مجسموں میں بھی چادر اسی طرح لپٹی دکھائی گئی ہے۔

ایک مجسمے میں کمر سے بندھی ہوئی ازار جیسی پوشاک دکھائی گئی ہے ہو سکتا ہے کہ یہ دھوتی ہو جس کو لپیٹ کر بنایا گیا ہو۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ عام طریقے پر تپتیا ڈیزائن کی شال اوڑھا کرتے تھے لیکن عام لوگ کمر سے اوپر کوئی کپڑا نہ پہنتے تھے صرف جسم کے نچلے حصے کو کسی کپڑے سے ڈھانک لیتے تھے یہ رواج آج بھی ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں موجود ہے۔

یہ لوگ سوتی کپڑے کے علاوہ کینوس کی طرح موٹے کپڑے پہننا بھی جانتے تھے کیونکہ اس قسم کے کپڑوں کی رگڑ کے نشانات مہروں پر ملتے ہیں البتہ کتان اور اونی کپڑوں کے استعمال کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اسی عہد میں ایلام اور سمیر میں کتان کا رواج تھا اور ہو سکتا ہے کہ وادی سندھ کے لوگ اسے در آمد کرتے اور استعمال کرتے ہوں اسی طرح اون کے استعمال کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہاں کی بھیڑ بکریاں اونی کپڑے کی تیاری کے لئے کافی خام مال فراہم کرتی ہوں گی اور وادی سندھ کے لوگوں نے تہذیب کے جو مدارج طے کر لئے تھے اس سے یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہو گا کہ شاید وہ اونی کپڑا تیار کرنا بھی جانتے تھے۔

آرائش گیسو

آرائش گیسو کے طریقوں کے بارے میں عورتوں کی بہ نسبت مردوں سے متعلق زیادہ شواہد دریافت ہوئے ہیں کیونکہ اوپر بیان کئے ہوئے سروں کی پوششوں کی وجہ سے عورتوں کے بال ڈھکے ہوئے ہیں۔ البتہ ایک مجسمے میں عورت کے گھنگریالے بال پیچھے کی جانب پڑے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک اور ٹوٹے ہوئے مجسمے کے بال بھی پیچھے پڑے نظر آتے ہیں۔

بعض نسوانی مورتیوں میں بالوں کو چوٹی گوندھ کر پشت کی جانب پھندا ڈال دیا گیا ہے۔ یہ طریقہ آج کل بھی رائج ہے۔ کانسے کی رقاصہ کے مجسمے کے بالوں کو یوں آراستہ کیا ہے کہ سامنے کی طرف ایک بل کھائی ہو اونچی لہر بن گئی ہے اور باقی بالوں کی چوٹی گوندھ کر دایاں کان چھپاتے ہوئے گردن اور شانے پر ڈال دیا گیا ہے عورتیں بالوں میں موباف اور کنگھی اڑستی تھیں۔

مردوں کے بال سنوارنے کے طریقے مختلف ہیں۔ راج پروہت کے بال پٹے نما ہیں ان کی پیشانی کے بیچ سے مانگ نکالی گئی ہے۔ اور زلفوں کو موباف سے کس کر باندھا گیا ہے۔ جیسا کہ سمیر میں بھی دستور تھا۔ ایک مجسمے کے بالوں کے جوڑے کے پیچ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بالوں کو گوندھ کر چوٹی بنائی جاتی تھی اور پھر اس چوٹی کو لپیٹ

کر جوڑا بنایا جاتا تھا مٹی کے چند مجسموں میں بالوں کا جوڑا سر کے اوپر چھلے کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ بالوں کے ایسے چھلے بھی بنائے جاتے تھے جو کانوں کو ڈھانپ لیتے تھے۔ ایک بچے کے مجسمے کے بال گھنگریالے دکھائے گئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے بال گھنگریالے ہوتے ہوں۔

وادی سندھ کے لوگوں میں داڑھی ترشوانے کے مختلف طریقے رائج تھے۔ بعض مجسموں کی داڑھیاں خشخشی دکھائی گئی ہیں بعض کے اوپری لب تراشیدہ ہیں جیسا کہ سمیر میں بھی دستور تھا لیکن ایسے مجسمے بھی ملے ہیں جن کی لبیں تراشیدہ نہیں ہیں۔ ایک مجسمے کی داڑھی چھوٹی اور باہر کی جانب نکلی ہوئی ہے اسی طرح مٹی کے ایک مجسمے کی داڑھی اندر کی طرف گھومی ہوئی ہے اور مصریوں کی باہر کی طرف نکلی ہوئی مصنوعی داڑھی کے بالکل برعکس ہے۔ ایک شبیہ کا پورا کلہ صاف ہے البتہ ٹھوڑی کے نیچے کچھ بال چھدرے چھدرے اگے ہوئے ہیں۔ ان مجسموں میں سب نہیں تو چند تو ضرور دیوتاؤں کے بت ہیں لیکن دوسرے تمام مجسموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے قدیم لوگوں کی داڑھیاں تراشیدہ اور چھوٹی ہوتی تھیں۔ اور سمیر کے لوگوں کی طرح لمبی اور گھنیری نہ ہوتی تھیں۔ کچھ لوگ گلمچھے بھی رکھتے تھے۔

زیورات

برصغیر ہند و پاکستان کی خواتین ہمیشہ سے زیورات کی دلدادہ رہی ہیں۔ وادی سندھ کی خواتین کا خمیر بھی اسی مٹی سے بنا تھا چنانچہ وہ بھی حسن و جمال کی آرائش کے لئے زیورات کثرت سے استعمال کرتی تھیں۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں سونے چاندی کی ملی جلی دھات، تانبا، کانسا، سیپ، گھونگھے، ہاتھی دانت اور کئی قسم کے قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں کے بنے ہوئے زیورات دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ زیورات چاندی تانبے یا کانسے کے برتنوں میں رکھے ہوئے پائے گئے ہیں کچھ زیورات متفرق طور پر بھی ملے ہیں۔ زیورات اکثر و بیشتر مکانوں کے فرش کے نیچے یا دیواروں کے اندر احتیاط سے دفن کئے ہوئے پائے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مالکوں نے کسی عارضی خوف

کی وجہ سے ان کو اس خیال سے دفن کر دیا تھا کہ اطمینان کے وقت نکال لیں گے لیکن شاید وہ وقت نہ آسکا یہاں تک کہ ہزاروں سال بعد آثار قدیمہ کے ماہروں نے ان کو باہر نکالا۔

زیورات کی سب سے دلچسپ دریافت رائے بہادر دیا رام ساہنی کے نکالے ہوئے چند قیمتی ہار اور منکے ہیں جو چاندی کے ایک برتن میں رکھ کر دفن کیے گئے تھے جن کے قریب ہی کچھ زیورات زمین پر بکھرے ہوئے پائے گئے تھے۔ اس برتن کو اچھی طرح کپڑے میں لپیٹ کر دفن کیا گیا تھا اور اس کپڑے کا بہت چھوٹا سا ٹکڑا خاک ہو جانے سے بچ گیا تھا۔ اسی طرح مسٹر ڈیکسٹ کو چاندی کے برتن میں بہت خوبصورت ہار سونے اور چاندی کی کچھ چیزیں اور موباف وغیرہ ملے تھے۔ ہڑپہ میں مسٹر وتس کو ایک بیش قیمت ہار چاندی کے ایک ڈبہ میں رکھا ہوا ملا تھا اس ہار میں ہرے اور نیلے نیم قیمتی پتھروں کے منکے اور سونے کے گول دانے ایک ایسی لڑی میں پروئے ہوئے تھے جس کے بیچ میں عقیق اور یشب کے آویزے بھی ڈالے گئے ہیں۔ اس کی بناوٹ بڑی نفیس اور نہایت سبک ہے جو ان لوگوں کے جمالیاتی ذوق کی مظہر ہے اس ہار کے ہمراہ بہت سے کڑے اور انگوٹھیاں بھی ملی ہیں۔

ایک ایسے مکان کے فرش کے نیچے سے جس میں کچی اینٹیں جمع کی گئی تھیں تانبے کی ایک ڈھکنے دار ہانڈی برآمد ہوئی تھی جس میں سونے کی کیلوں کے علاوہ چاندی کے بندے دوسرے زیورات اور عقیق کے منکوں کی دو کردھنیاں ملی تھیں۔ ان کردھنیوں میں چھ چھ لڑیاں ہیں ہر لڑی میں لمبی ڈھولک کی شکل کے سرخ عقیق کے پانچ منکے پروئے گئے ہیں۔ ان منکوں کے دونوں سروں پر کانسے کے بنے ہوئے گول دانے پڑے ہیں ان دانوں کے درمیان کانسے کی ایسی کھڑی پٹیاں پروئی گئی ہیں جن میں چھ چھ سوراخ ہیں اور ہر سوراخ سے لڑیوں کی ڈوریاں گذرتی ہیں۔ اس تین فٹ چار انچ لمبی کردھنی کے دونوں سروں پر کانسے کی D شکل کے کون ہیں جن میں ایک طرف تو چھ سوراخ ہیں اور دوسری طرف ایک چنانچہ یہ لڑیاں ان چھ سوراخوں سے گذر کر ایک سوراخ سے باہر آتی ہیں اور آپس میں مل جاتی ہیں۔ عقیق کے منکوں کے اوپر اور

ان کے سوراخوں میں نہایت صفائی سے پالش کی گئی ہے اور خیال ہے کہ ان میں پتھر یا تانبے کے برموں سے سوراخ کئے گئے ہوں گے اور ان کو چمکانے اور پالش کرنے کے لئے سباذج کا سفوف استعمال کیا گیا ہو گا سستی اور معمولی کردھنیاں بھی ملی ہیں۔ جن میں عقیق کے بجائے پکائی ہوئی مٹی کے خوبصورت دانے پڑے ہیں لیکن ان کی وضع قطع قیمتی کردھیوں کی سی ہے۔

ان کے علاوہ یہاں سے کئی قسم کے ہار بھی ملے ہیں۔ جن میں سے ایک انوکھی وضع کا خوبصورت ہار قابل ذکر ہے اس ہار میں صرف ایک لڑی ہے جس میں سبز نیم قیمتی پتھر کے ڈھول کی شکل کے منکے پروئے گئے ہیں۔ ان منکوں کے دونوں طرف ایک ایک گول دانہ پڑا ہے۔ ان دانوں کے بعد سونے کی چپٹی دو ورقی گول پتیاں ہیں جن کو اس طرح جوڑا گیا ہے کہ ان کے بیچ میں لڑی کی ڈور گذرنے کے لئے نالی رکھی گئی ہے۔ اس میں عقیق یمنی اور یشب کے سات آویزے پروئے گئے ہیں اور اس طرح یہ پورا ہار بڑا جاذب نظر دکھائی پڑتا ہے۔

دست بند، کنگن اور کڑے بھی کافی تعداد میں دریافت ہوئے ہیں۔ ان کا بہترین نمونہ چھ لڑیوں والا وہ دست بند ہے جس میں سونے کے گول منکے پروئے گئے ہیں۔ سات سات منکوں کے درمیان سونے کی چھ چپٹی پتیاں لگائی گئی ہیں ہر پتی میں چھ سوراخ ہیں اور ہر سوراخ میں ایک لڑی گذرتی ہے۔ اس کے دونوں سروں پر D شکل کے کون لگائے گئے ہیں جن میں ایک طرف چھ سوراخ ہیں اور دوسری طرف صرف ایک۔ یہ لڑیاں ان سوراخوں سے گذر کر ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ ایسے سادے اور خوبصورت دست بند موہنجوداڑو میں کئی مقامات پر ملے ہیں۔

وادی سندھ کے قدیم باشندے بال باندھنے کے لئے موباف استعمال کرتے تھے یہ موباف عام طور پر نصف انچ چوڑی سونے چاندی اور دوسری دھاتوں کی بنی ہوئی پتلی پٹیاں ہوتی تھیں جن کی وضع سیدھی مخروطی یا محراب دار ہوتی تھی بعض بعض موباف 16 انچ تک لمبے ہوتے تھے اور ان کے کناروں پر سوراخ ہوتے تھے۔ جن میں دھاگا ڈال کر ان کو سروں کے گرد باندھا جاتا تھا بعض موباف پر کسی نوکیلی چیز سے نقطے ڈال

کر نقاشی کی گئی ہے۔ سمیر میں بھی ایسے موباف کثرت سے مستعمل تھے۔ پیشانی پر نوکیلے قسم کا جھومر استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسے جھومر مارواڑی عورتیں آجکل بھی پہنتی ہیں۔ کانوں میں بالیاں پہننے کے رواج کا اندازہ مجسموں پر بنی ہوئی نقاشی سے لگایا گیا ہے۔ لیکن بالیاں شاذ و نادر ہی دریافت ہوئی ہیں۔ سونے کی بنی ہوئی دندانے دار چند ایسی ٹکیاں ملی ہیں جن کے پیچھے کیل جڑی ہوئی ہے لیکن یہ ناک کی کیل کی بہ نسبت کانوں کے ٹاپس سے زیادہ مشابہ ہیں۔

ہاتھوں میں کنگن اور دست بند کے علاوہ چوڑیاں پہننے کا عام رواج تھا یہ چوڑیاں سونے چاندی، تانبے، کانسے ہاتھی دانت اور مٹی کی بنی ہوئی ہوتی تھیں سونے اور چاندی کی چند پولی اور کھوکھلی چوڑیاں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ غریب عورتیں مٹی کی چوڑیاں پہنتی تھیں۔ جو نہایت نفاست سے بنائی جاتی تھیں۔ بعض چوڑیوں پر تصویری نقاشی بھی کی گئی ہے۔ رقاصہ کے مجسمے کے بائیں ہاتھ میں کلائی سے بغل تک چوڑیاں ہی چوڑیاں نظر آتی ہیں سندھ اور گجرات (ہندوستان) میں آج بھی پورے پورے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنی جاتی ہیں۔ خیال ہے کہ رقاصہ کے ہاتھ کی چوڑیاں یا تو ہاتھی دانت کی تھیں یا سنکھ کی کیونکہ اگر یہ کسی دھات یا مٹی کی بنی ہوئی ہوتیں تو ان کے بوجھ کی وجہ سے ہاتھ اٹھانا بھی مشکل ہو جاتا۔ شیشے کی چوڑیاں موہنجوداڑو میں دریافت نہیں ہوئی ہیں اور نہ ہی شیشے کی کوئی دوسری چیز ملی ہے۔

انگلیوں کی زیبائش انگوٹھیوں اور چھلوں سے کی جاتی تھی ان انگوٹھیوں میں بعض بالکل سادہ گول یا چپٹے تار کے چھلوں جیسی ہیں۔ بعض ایک ہی تار کو کئی بار چھلوں کی شکل میں موڑ کر بنائی گئی ہیں۔ اس طرز پر بنے ہوئے چھلوں میں سات سات پھیر ہیں۔ عام طور پر انگوٹھیاں تانبے یا کانسے کی بنائی جاتی تھیں۔ چاندی کی صرف ایک انگوٹھی ملی ہے جس میں ایک چپٹے تار کے اوپر نگ رکھنے کی جگہ چپٹے چوکور ماتھے پر ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے خطوط کھینچے گئے ہیں۔

پیروں میں کڑے پہننے کا رواج تھا۔ مٹی کے چند مجسموں کے پیروں میں کڑے پائے گئے ہیں۔ کانسے کے ایک مجسمے کے پیروں میں بالکل اسی قسم کا کڑا پڑا ہے جیسا کہ

آج بھی شملہ (ہندوستان) کی پہاڑی عورتیں پہنتی ہیں۔ اسی قسم کے کڑے کریٹ میں بھی پہنے جاتے تھے۔

بالوں میں کنگھا لگایا جاتا تھا۔ ایک دہرے دندانے والا ہاتھی دانت کا بنا ہوا کنگھا جس کے دونوں طرف گول دائروں کی نقاشی کی گئی ہے ایک نوجوان خاتون کے کاسہ کے قریب ملا تھا۔ ایک اور V شکل کا کنگھا بھی دریافت ہوا ہے۔ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ایک خوبصورت کنگھی بھی ملی ہے جس میں موجودہ کنگھیوں کی طرح دونوں طرف دندانے ہیں۔

تانبے کانسے اور چینی کے گول بٹن بھی دریافت ہوئے ہیں۔ یہ شکل و صورت میں عام طور پر مالٹا' پرتگال اور جنوبی فرانس کے بٹنوں سے مشابہ ہیں جو وضع میں سادہ ہیں اور ان کے پشت کی جانب تاگا پرونے کے لئے دو سوراخ بنائے گئے ہیں۔ کانسے کے بٹن گھنڈی نما ہیں اور ان میں اوپری جانب دو سوراخ ہیں۔

سنگھار

وادی سندھ کی عورتیں سنگھار کی دلدادہ اور مشاق تھیں اور افزائش حسن کے لئے سرمہ اور غازہ استعمال کرتی تھیں۔ چنانچہ سرمہ دانیاں اور سلائیاں کثیر تعداد میں پائی گئی ہیں ان کی اس کثرت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً مرد اور عورتیں دونوں سرمہ لگاتے تھے۔ آجکل بھی سندھ میں سرمہ عام طریقہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سرمے کے علاوہ گھونگھے اور سیپ کی ڈبیوں میں سرخ رنگ کا سفوف بھی ملا ہے جو غالباً غازے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ایسی ہی ڈبیوں میں اسی قسم کا غازہ کش اور ار کے مقبروں سے بھی دریافت ہوا ہے۔

ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں سیسے کا کاربونیٹ بھی ملا ہے جو شاید چہرے کو سفید کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہو گا۔ اس کے علاوہ تزئین کے لئے شنگرف بھی مستعمل تھا۔ ایک قسم کا ایسا سبز مادہ بھی دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں مسٹر میکی کا خیال ہے کہ وہ شاید کاجل کی طرح استعمال کیا جاتا ہو جیسا کہ مصر میں ملاکیٹ! مستعمل تھا۔

تانبے کے گول آئینے بھی ملے ہیں جن کے کنارے جلا محفوظ رکھنے کے لئے ابھرے رکھے جاتے تھے۔ پیروں کو صاف کرنے کے لئے مٹی کے جھانوے استعمال کئے جاتے تھے۔

کھلونے

وادی سندھ کے قدیم بچے اس کے موجودہ بچوں کی طرح کھلونوں کے معاملے میں خوش قسمت تھے۔ یہاں لاتعداد کھلونے ملے ہیں جن سے یہ بھی اندازہ لگتا ہے کہ اس عہد کے والدین اپنے بچوں کی دلچسپی اور ان کے کھیل کود پر کتنی توجہ دیتے تھے یہاں مٹی، سیپ، پتھر اور ہاتھی دانت کے ہر قسم کے کھلونے پائے گئے ہیں جو اس صنعت کی ترقی کے مظہر ہیں (پلیٹ نمبر 16-17) خیال ہے کہ لکڑی کے کھلونے بھی بنائے جاتے ہوں گے جو تلف ہو گئے البتہ مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بکثرت ملی ہیں جو وضع قطع میں ان بیل گاڑیوں سے ملتی جلتی ہیں جو آجکل بھی شمالی سندھ کے دیہاتوں میں سڑکوں پر چلتی نظر آتی ہیں۔ ان سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ موہنجوداڑو کے لوگ مسافرت اور بار برداری کے لئے بیل گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔ چند گاڑیوں کے ساتھ ساتھ مٹی کے بنے ہوئے بیل بھی ملے ہیں۔ یہاں ایسے رتھ دریافت نہیں ہوئے ہیں جو عام طریقہ پر میدان جنگ میں کام آتے تھے۔

کھلونوں میں وہ جھنجھنے خاص طور پر دلچسپ ہیں جو گیند کی طرح گول اور اندر سے کھوکھلے ہیں ان کے اندر چھوٹی چھوٹی کنکریاں پڑی ہوئی ہیں جن کے ہلنے سے آواز پیدا ہوتی ہے یہ کھلونے بچوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ ایسی چڑیاں بھی ملی ہیں جو کھوکھلی ہیں جن کی دم کے پاس ایک سوراخ ہے۔ یہ بچوں کی سیٹیاں تھیں۔ ان کی دم کے سوراخ میں پھونکنے پر آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کئی قسم کی بنی ہوئی چڑیاں ملی ہیں ایک چڑیا چونچ کھولے ہوئے دکھائی گئی ہے گویا چوں چوں کر رہی ہے۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں چڑیوں کے پنجرے بھی ملے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چڑیاں پالی بھی جاتی تھیں۔

ایک پنجرے کی کھڑکی سے ایک چڑیا باہر نکلتی ہوئی دکھائی گئی۔ بانس پر چڑھتے ہوئے بندر' یا کسی دوسرے جانور کے بھی بہت سے نمونے ملے ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے سینگوں والے بیل گینڈے' بھینس' شیر' سور' بندر' کتا' خرگوش' بکری' آبی جانوروں میں مچھلی مگرمچھ اور کچھوا پرندوں میں مرغی' طوطے اور فاختہ کے بھی چھوٹے چھوٹے مجسمے دریافت ہوئے ہیں۔ ترازو کے چند چھوٹ چھوٹے پلڑے بھی دریافت ہوئے ہیں جن میں ڈوریاں ڈالنے کے سوراخ بھی ہیں۔ پلڑے بہت بھدے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں نے بنائے ہیں۔ اسی طرح گھروں میں برتنے والے برتنوں کی وضع کے چھوٹے چھوٹے مٹی کے کھلونے بھی پائے گئے ہیں اور ان میں سے بعض بعض پر تو بچوں کی ننھی ننھی انگلیوں کے نشان بھی ہیں۔ عہد طفولیت کی معصوم مشغولیت کے یہ نشان کتنے دلچسپ ہیں!

اعلیٰ قسم کے بنے ہوئے کھلونوں میں ایسی قسم کے جانور ہیں جن کے سر دھڑ سے الگ بنائے گئے ہیں۔ یہ سر کھوکھلی گردن میں ایک ہک کے ذریعے پھنسائے جاتے تھے اور کوہان میں ایک سوراخ کر کے اس کے اندر سے ایک ایک ڈور گذار کر ان سروں میں باندھ دی جاتی تھی۔ اس طرح ڈور کھینچنے پر یہ سر ہلتے تھے اسی طرح بندر کی شکل ایک جانور ملا ہے جس کے ہاتھ ہلتے ہیں۔ ایسے کھلونے بھی ملے ہیں جن میں اس حکمت سے سوراخ کئے گئے ہیں کہ ان میں تاگا ڈال کر حسب دلخواہ رفتار سے اوپر نیچے دوڑایا جا سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے لڑکیوں کا محبوب ترین کھلونا یعنی گڑیا کہیں نہیں ملی۔ یہ کپڑے یا لکڑی کی بنائی جاتی تھی اس لئے امتداد زمانہ سے تلف ہو گئی ہو گی۔

تفریح

پانسہ ـــــــ برصغیر ہند و پاکستان کی ابتدائی تاریخ میں پانسہ کو بڑا دخل رہا ہے۔ اسی کی بدولت ید ھسٹر راج پاٹ دھن دولت حتیٰ کہ اپنی رانی درو پدی تک سے ہاتھ دھو بیٹھا اسی طرح راجہ نل کا قصہ بھی زبان زد خاص و عام ہے اور آج بھی پانسہ اور کوڑیاں کھیلنے والے راجہ نل کی دہائی دیتے ہیں۔ رگ وید میں بھی اس کھیل کا کئی

مقاملت پر ذکر ہے لیکن یہ کھیل اس عہد سے بھی بہت قدیم ہے اور وادی سندھ کے لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وادی سندھ کے پانسے مٹی اور پتھر کے بنے ہیں ان کی چھ سمتوں میں مختلف تعداد میں گول نشان بنے ہیں۔ یہ نشان ایک سے چھ تک ہیں اور اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک کے بالمقابل دو ہے تین کے بالمقابل چار اور پانچ کے مقابل چھ۔ اس قسم کا مٹی کا بنا ہوا ایک پانسہ موصل کے قریب ٹیپ گوارا کی چوتھی تہ سے ملا ہے جو تقریباً 2355 سال قبل مسیح کا بنا ہوا ہے۔ بعض پانسوں کے کونے گھسے ہوئے ہیں غالباً ان کو کسی نرم چیز پر پھینکا جاتا ہو گا۔ بعض چوکور پانسوں میں جو عام طور پر ہاتھی دانت کے بنائے گئے ہیں تین سمتوں میں تو ایک دو اور تین نشانات ہیں اور چوتھی سمت میں لمبے لمبے خطوط کھینچے گئے ہیں۔ کچھ پانسوں کے ہر جانب مختلف تصویری تحریر ہے جو ابھی تک پڑھی نہیں جا سکتی۔ ایسے کندہ پانسے بھی دریافت ہوئے جنہیں نجومی قسمت کا حال بتانے میں استعمال کرتے ہیں۔

موجودہ شطرنج کے پیادوں کی طرح مٹی پتھر اور یشب کے لاتعداد مہرے ملے ہیں ان میں سے بعض بہت خوبصورت ہیں۔ یہ جسامت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ بات یقینی طور سے نہیں کہی جا سکتی کہ واقعی شطرنج کے مہرے ہی ہوں گے۔

موہنجوداڑو سے ایک ایسی اینٹ بھی دریافت ہوئی ہے جس پر چار چوکور خانوں کی تین قطاریں کھدی ہوئی ہیں ان میں سے ایک خانہ میں متوازی الاضلاع اور اس کے وتر ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے بنائے گئے ہیں۔ گویا اس کی شکل کی طرح کی ہے۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ چوسر کی بساط کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس اینٹ کے ساتھ ہی اس قسم کی اور اینٹیں ہوں گی جس سے تین خانوں کی دس قطاریں ہوں گی اور ان پر مصریوں کی طرح دسی کھیلی جاتی تھی اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس میں چھبیس خانے تھے جو اس طرح بنائے گئے ہوں گے کہ ایک طرف تین قطاروں میں بارہ خانے دوسری طرف دو قطاروں میں بارہ خانے اور ان دونوں کے بیچ میں دو خانے ہوں تو یہ سر وولی کی ار سے دریافت کی ہوئی سمیری بساط سے مماثلت رکھتی ہو گی۔ یہ اینٹ ایک فرش

سے دستیاب ہوئی ہے اور یہ کھیل فرش پر بیٹھ کر ہی کھیلے جاتے ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی اینٹیں ملی ہیں اور یہ قیاس صداقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ چوسر اور سر بگھی کے قسم کے کھیل یہاں کھیلے جاتے ہوں گے۔ البتہ ان کا نام کچھ اور رہا ہو گا۔ اور کھیلنے کے طریقے بھی مختلف ہوں گے۔ یہاں مٹی اور پتھر کی بہت سی گولیاں بھی ملی ہیں۔

ایک مہر پر دو پرندے ایک دوسرے پر جھپٹتے دکھائے گئے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پرندے بازی بھی یہاں کا محبوب مشغلہ تھا اور جس طرح آج کل بلبل' مرغ' تیتر اور بٹیریں لڑائی جاتی ہیں اسی طرح وادی سندھ کے لوگ بھی پالیاں بدلتے ہوں گے۔ بیلوں کی لڑائی ہوتی ہو گی۔ مرغ لڑتے ہوں گے۔ بہرحال یہ تفریحیں نئی نہیں ان کا وجود کریٹ کی پرانی تہذیب میں بھی ملتا ہے۔

شکار

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وادی سندھ کے لوگ گوشت خور تھے وہ پالتو جانوروں کے علاوہ جنگلی جانوروں کو شکار کر کے بھی گوشت فراہم کرتے تھے۔ ایک مہر پر دو آدمیوں کو تیر کے ذریعہ ہرن کا شکار کرتے دکھایا گیا ہے دوسری مہر پر جنگلی بکری کو ہدف بنایا گیا ہے۔ اسی طرح موہنجوداڑو کے ایک مقام سے بہت سے تیر ملے ہیں جن کو شکار میں استعمال کیا جاتا ہو گا۔ یہاں کی تصویری تحریر میں بھی تیر کمان کے نشان ملتے ہیں ان کے علاوہ مٹی کی پختہ گولیاں یا غلے بھی ملے ہیں جن سے کمان کی شکل کی غلیل کے ذریعہ چڑیوں کا شکار کیا جاتا تھا۔ چوہوں کے پکڑنے کے لئے مٹی کے پھندے یا چوہے دان استعمال کئے جاتے تھے۔ اس قسم کے چوہے دان موہنجوداڑو میں دریافت ہوئے ہیں۔ مچھلی پکڑنے کے سینکڑوں کانٹے اور جال کے ڈبونے کے لئے استعمال کی جانے والی گولیوں کی دریافت اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہاں مچھلی کے شکار کا بھی عام رواج تھا۔ مٹی کے بنے ہوئے چند ایسے کتے بھی ملے ہیں جو شباہت میں شکاری کتوں سے ملتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کتے جانوروں کے شکار میں استعمال کئے جاتے

ہوں۔

پالتو جانور

وادی سندھ کے باشندے جانوروں کے گوشت ہی کے شائق نہ تھے بلکہ وہ جانوروں کو پالتے بھی تھے ان پالتو جانوروں کی اقسام کچھ کم نہ تھیں۔ چنانچہ کھدائی میں کوہان والے بیل یا سانڈ' بھینسا' بھیڑ' ہاتھی' سور اور مرغ کے ڈھانچے اور ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ پالتو جانوروں کے بارے میں بچوں کے کھلونے اور مہروں پر نقش کی ہوئی تصویریں بھی ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھینسے' بندر' کتا' بلی' طوطا' مور اور مرغ سے اچھی طرح واقف تھے۔ گدھے کی موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا اور محققین میں اس بارے میں کافی اختلاف ہے کہ آیا وادی سندھ کے لوگ گھوڑے سے بھی واقف تھے۔

وادی سندھ میں سانڈوں کے ڈھانچے بڑی کثرت سے ملے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے بیلوں کی نسل لینے کا اچھا انتظام تھا۔ یہ بیل سندھ' شمالی گجرات اور راجپوتانہ کے موجودہ شاندار بیلوں سے کلی طور پر مشابہ تو نہیں البتہ ان چھوٹے کوہان والے بیلوں سے بالکل مختلف ہیں جو آجکل وسط ہند اور دکن میں عام طور سے پائے جاتے ہیں ان کے علاوہ سندھ اور بلوچستان میں بغیر کوہان اور چھوٹی سینگوں والے بیل بھی ہوتے تھے۔

اس سلسلے کی سب سے دلچسپ دریافت ایک ایسی پختہ اینٹ ہے جس پر ایک کتے اور بلی کے پیروں کے نشان بنے ہیں۔ قیاس ہے کہ یہ نشان اس وقت پڑے ہوں گے جب گیلی مٹی کی اینٹیں سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھی گئی ہوں گی کسی کتے نے بلی کا پیچھا کیا ہو گا اور بلی ان اینٹوں کے اوپر سے بھاگی ہو گی کتا بڑی تیزی سے اس کے پیچھے دوڑا ہو گا۔ یہ نشان کافی گہرے ہیں اور اس طرح سے بنے ہیں کہ تیز دوڑنے کے علاوہ کسی اور طرح نہیں پڑ سکتے۔ یہ تیز بھاگنے والی بلی اور اس کا پیچھا کرنے والا کتا تو نہ

جانے کب کے خاک ہو چکے لیکن اینٹوں پر پڑے ہوئے نشان زبان حال سے جہد بقا کی مسلسل اور مستقل داستان سنا رہے ہیں۔

جنگلی جانور

ان جانوروں سے قطع نظر جن کا ذکر شکار یا پالتو جانوروں کے ضمن میں کیا گیا ہے یہاں ایسے جانوروں کی موجودگی کا سراغ بھی ملتا ہے جو گھروں میں آیا جایا کرتے تھے جسے نیولا اور سیاہ چوہا ان کے علاوہ خرگوش بھی موجود تھا۔ شیر' ریچھ' ہاتھی اور گینڈے جیسے وحشی جانور عام تھے۔ ہرن چار قسم کے ہوتے تھے۔ 1- کشمیری بارہ سنگھا 2- سانبھر 3- چیتل اور 4- پاڑہ ہرن۔ ان ہرنوں کے صرف سینگ ہی پائے گئے ہیں۔ ممکن ہے یہ سینگ دواؤں میں استعمال کئے جانے کے لئے دور دور سے منگائے گئے ہوں' کشمیری بارہ سنگھا آجکل صرف کشمیر اور ہمالیہ کے نواح میں ملتا ہے۔ چیتل آجکل نہ سندھ میں پایا جاتا ہے اور نہ پنجاب میں۔ اسی طرح سانبھر بھی سندھ راجپوتانہ اور پنجاب میں نہیں ملتا پاڑہ ہرن اب بھی سندھ میں ملتا ہے۔

رقص و سرود

موہنجوداڑو کے لوگ رقص و سرود کے بڑے شائق معلوم ہوتے ہیں اس کا ثبوت رقاصہ کا کانسہ کا بنا ہوا مجسمہ ہے۔ اسی طرح ہڑپہ سے پتھر کا ایک اور مجسمہ بھی دریافت ہوا جو عالم رقص میں ہے۔

رقص قدیم ہندوستان کی مذہبی رسوم میں ایک اہم مقام رکھتا تھا اور پرستش کا ایک خاص جزو ہوتا تھا۔ معلوم نہیں موہنجوداڑو میں اس کو مذہبی حیثیت حاصل تھی یا محض تفریح اور دل بہلانے کا ذریعہ تھا۔ ناچ کے ساتھ گانے بجانے کا انتظام ایک فطری امر ہے اور اس کا وجود ڈھولک کی اس تصویر سے ثابت ہوتا ہے جو ایک مہر پر کندہ ملی ہے اسی طرح ایک اور مہر پر ایک مردانی شبیہ کی گردن میں ڈھولک یا مردنگ لٹکا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ناچنے والے کو تھاپ دینے کے لئے کھڑتال بھی مستعمل تھی جس کے

چند نشانات پائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ وادی سندھ کی تصویریں تحریر میں ایسے بہت سے نقوش ملے ہیں جن کو بربط اور چنگ کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے ساز سمیر میں بھی مستعمل تھے۔

حکمت

اس قسم کے شواہد بہت کم دریافت ہوئے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وادی سندھ کے لوگ طب، نجوم اور علم الحساب سے بھی واقف تھے۔ البتہ یہاں سمندری جھاگ اور بارہ سنگھے کے سینگ کے ٹکڑے دریافت ہوئے ہیں۔ جن کی موجودگی اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ چیزیں ضرور یہاں کے ویدوں کے نسخوں کا جزو ہوں گی۔ ایک ایسا سیاہ مادہ بھی ملا ہے جس کو سلاجیت تجویز کیا گیا ہے۔ سلاجیت ذیابیطس اور جگر کے امراض اور گھٹیا وغیرہ کے لئے اکسیر ہے اسی طرح مٹی کی ہانڈیوں میں وہ شاخہ یا استخوان ماہی رکھی ہوئی ملی ہے یہ بھوک بڑھانے کے لئے استعمال کی جاتی ہو گی اور بیرونی طور پر کان آنکھ گلا اور جلدی امراض میں استعمال کی جاتی ہو گی۔ مونگے اور نیم کی درخت کی پتیاں بھی احتیاط سے رکھی ہوئی پائی گئی تھیں اور ادویات کے طور پر کام آتی ہوں گی ان تمام چیزوں سے یہ عام اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس تہذیب میں "ایورویدک" طریق علاج ابتدائی دور میں تھا۔

صحیح سمتوں میں باقاعدہ ترتیب سے بنے ہوئے مکانات اور سڑکوں سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ سماوی اثرات کے قائل تھے اور علم نجوم سے بھی شغف رکھتے تھے۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ یہاں کے لوگوں کا سال شمسی حساب سے تھا۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا گیا ہے کہ دریائے سندھ میں برسات کے خاص مہینوں میں طغیانی اور اسی طرح مقررہ مہینوں میں جاڑے اور گرمی کے موسم آتے ہوں گے اور موسموں کی یہ تبدیلی سورج کے عمل کے تابع ہے۔ چنانچہ قیاس کیا گیا ہے کہ یہ لوگ چاند کی کی بہ نسبت سورج سے زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ اس کا مزید ثبوت

سواستکا کے بہت سے نشانات کا پایا جانا بھی ہے جن کو سورج کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

پیشے

جو باقیات اب تک دریافت ہوئی ہیں۔ ان سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہاں کے ارباب علم پروہت' وید' جوتشی اور ساحروں پر مشتمل تھے۔ حکام میں حکومت کے عمال اور بلدیہ کے ملازمین تھے۔ یہاں ایک تجارت پیشہ قوم آباد تھی بیشتر لوگ صنعت کار اور اہل حرفہ میں سے تھے اور کاشتکار مچھیرے' ملاح بھیڑوں اور گایوں کے چرواہے' گاڑی بان' گھریلو نوکر' زرگر' عقیق اور ہاتھی دانت کے کاریگر' کمہار کھلونے ساز' ٹھٹھیرے' راج' معمار' مکان بنانے والے مزدور' لکڑ ہارے' سنگ تراش اور مہر تراش تھے اور ان تمام پیشہ وروں کی موجودگی کے کچھ نہ کچھ شواہد ضرور ملتے ہیں۔



جلال الدین خوارزم شاہ: ہیرو یا لٹیرا

ڈاکٹر این۔اے۔بلوچ سندھ کی تاریخ پر اتھارٹی مانے جاتے ہیں۔انہوں نے ڈان اخبار میں جلال الدین خوارزم شاہ پر ایک آرٹیکل لکھتے ہوئے اس کے بارے میں کہا کہ وہ ایک بہادر' جری اور نڈر جنرل تھا کہ جس نے ایک اہم مقصد کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ان کا یہ آرٹیکل اگر جلال الدین خوارزم شاہ اور چنگیز خاں کے درمیان جو جنگیں ہوئیں ان تک محدود ہوتا تو ان کے یہ ریمارکس ایک حد تک صحیح ہو سکتے تھے۔مگر انہوں نے اپنے اس مضمون میں جلال الدین کے ہندوستان میں آنے اور خاص طور سے سندھ میں اس کے قیام سے متعلق تفصیلات دی ہیں اور اس کے مذہبی لگاؤ کا اظہار اس کی سندھ میں ایک تعمیر شدہ مسجد سے کیا ہے۔

جلال الدین خوارزم شاہ کی زندگی اور اس مہمات کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ جب اس نے وسط ایشیا میں منگولوں کا مقابلہ کیا اور بہادری سے لڑا۔ بالآخر اسے شکست ہوئی اور وہ فرار ہو کر ہندوستان میں آیا۔اول تو اس نے اس وقت کے سلطان التمش سے مدد کی درخواست کی۔سلطان کو اس بات کا پورا پورا اندازہ تھا کہ اس کی سیاسی اور فوجی قوت اس قابل نہیں ہے کہ وہ منگولوں کی طاقت کا مقابلہ کر سکے' اس لیے اس نے اس جنگ میں کہ جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا' الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور جلال الدین کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ ''اس ملک کی آب و ہوا' جناب کے لیے مناسب نہیں ہے۔'' جب سلطان کی طرف سے اسے کوئی مدد نہیں ملی تو اس نے اپنی فوج کے ساتھ ملتان اور اچ پر حملہ کر دیا کہ جہاں اس وقت ناصر الدین قباچہ (1228-1206) کی حکومت تھی' جو بحیثیت حکمراں کے اپنی رعایا کے لیے مہربان اور ہمدرد تھا۔جلال الدین نے مقامی قبائل سے

معاہدہ کر کے قباچہ کے خلاف جنگ لڑی اور اسے شکست دے کر اس سے خطیر رقم بطور تاوان کے وصول کی۔ اس نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اچ شہر کو آگ لگا دی اور اپنی فوج اور علیفوں کے ساتھ سہون کی طرف روانہ ہوا۔ سہون کے گورنر نے جب یہ دیکھا کہ اس میں مقابلہ کی سکست نہیں ہے تو اس نے شہر کو جلال الدین کے حوالے کر دیا' ایک مہینہ قیام کے بعد اس نے وہاں سے ٹھٹھہ کی جانب پیش قدمی کی۔ راستے میں ہر قسم کے مظالم کو روا رکھا' لوگوں کا قتل عام کیا' گاؤں اور شہروں کو لوٹا اور جلایا اور تباہی و بربادی کے نشانات چھوڑتا ہوا 1223ء میں ٹھٹھہ پہنچا۔ شہر کے گردونواح میں لوٹ مار کرنے کے بعد اس نے دیبل شہر کو تباہ و برباد کیا۔

یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ ایک وہ شخص کہ جس نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ جس نے اپنے ملک کو تباہ و برباد ہوتے دیکھا' شہروں کو لٹتے اور جلتے دیکھا' لوگوں کے قتل عام کا مشاہدہ کیا۔ جب اسے ایک دوسرے ملک میں آنے کا موقع ملا تو بجائے اس کے کہ وہ پرامن شہری کی طرح رہتا' ان لوگوں کا شکر گزار ہوتا کہ جنہوں نے اسے پناہ دی تھی' اس کے بجائے اس نے بھی وہی راستہ اختیار کیا کہ جو منگولوں نے کیا تھا۔ کردار اور عمل کے اعتبار سے اس میں اور منگولوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ وہ سندھ کے لوگوں کے لیے ایک عذاب بن کر آیا اور اس تھوڑے عرصہ میں کہ جو وہ یہاں رہ (1223-1221) اس نے سندھ کی تباہ و برباد کر دیا۔ جب وہ اس ملک سے گیا ہے تو اپنی یاد میں جلے ہوئے قصبے و گاؤں اور ویران شہروں کو بطور یادگار چھوڑا۔

اس کے اس قیام کے اثرات نہ صرف لوگوں پر ہوئے' بلکہ اس نے ہندوستان کی اندرونی سیاست میں تبدیلیاں کیں۔ ناصرالدین قباچہ جس کے مرکزی شہر ملتان اور اچ تھے جس نے اپنی اصلاحات کے ذریعہ اپنے علاقوں میں امن و خوشحالی قائم کر دی تھی اور جس کے دربار میں وسط ایشیا کے مہاجرین پناہ گزین تھے' جن میں علماء ادباء اور شعراء کی بڑی تعداد شامل تھی' جلال الدین کے حملوں کی وجہ سے اس کی فوجی طاقت بے انتہا کمزور ہو گئی۔ گاؤں اور کھیتوں کی تباہی نے اس کے ذرائع آمدن گھٹا دیئے اس لیے جب التمش نے اس پر حملہ کیا تو وہ یہ نہ سہار سکا اور شکست کھا گیا۔

جلال الدین کی آمد کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے منگولوں کو ہندوستان کا راستہ دکھا دیا' ابتداء میں تو وہ اس کی تلاش میں آئے اور جب وہ نہ ملا تو لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے بعد واپس چلے گئے' مگر اس کے بعد سے ان کے حملے ہندوستان پر جاری رہے اور ہندوستان کے استحکام کے لیے

خطرہ رہے‘ یہاں تک کہ علاؤالدین نے سخت فوجی اقدامات کے ذریعہ ان کا خاتمہ کیا۔

جلال الدین ہندوستان سے ایسے ہی رخصت ہوا جیسے کہ وہ آیا تھا‘ یعنی ایسا مہمان کہ جسے کوئی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس نے نہ تو منگولوں کے خلاف جنگ کر کے کچھ حاصل کیا اور نہ ہندوستان رہ کر کوئی کارنامہ سرانجام دیا اس وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ وہ محض ایک حملہ آور اور لٹیرا تھا جو کہ اہل سندھ کے لیے عذاب بن کر آیا اور ان کی مصیبتوں میں اضافہ کیا۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آخر ہمارے مورخ کیوں تاریخ کو وسیع تناظر میں نہیں دیکھتے ہیں اور آخر کیوں حکمرانوں‘ فوجی جنرلوں اور شخصیتوں کی تعریف و توصیف کر کے ان کی بداعمالیوں کو کارناموں کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ مورخ شاید اب تک تاریخ کے اس فلسفہ سے متاثر ہیں کہ جس میں ''عظیم شخصیتوں'' کو تاریخ ساز بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ خاص طور سے پاکستان میں یہ نظریہ تاریخ بڑا مقبول ہے۔ مثلاً اسلام آباد میں قائم ٹیکسلا انسٹی ٹیوٹ نے ایسے سمیناروں کا انعقاد کیا کہ جن میں فاتحین کی شخصیتوں کو اجاگر کیا گیا۔ ایک سمینار لاہور میں غزنوی سلاطین اور ان کے دور حکومت پر ہوا‘ تو دوسرا سمینار شہاب الدین غوری پر اسلام آباد میں ہوا‘ ان دونوں سمیناروں میں ان دو فاتحین کو عظیم ہیروز کے طور پر پیش کیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر فاتحین اور فوجی جنرلوں پر اس قدر توجہ کیوں ہے؟ شاید اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ میں ان فاتحین اور فوجی جنرلوں کے علاوہ کسی دانشور‘ فلسفی‘ ادیب و شاعری‘ مصور اور انجینئر کو اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ ان کے تخلیقی کاموں کو سامنے لائیں۔ دوسرے یہ کہ ہماری اپنی جدید تاریخ میں ہم کئی بار اپنے فاتحین کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں کہ جس کی وجہ سے ہماری عزت و وقار ختم ہو گیا ہے اور ہم ذہنی طور پر اس قدر پسماندہ اور ہارے ہوئے ہیں کہ ہیروز اور عظیم شخصیتوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں کہ وہ ہمیں سہارا دیں گے اور ہمارے مسائل کا حل کریں گے۔

دوسری وجہ شاید یہ ہو کہ ہم نے ماضی میں کچھ حاصل نہیں کیا ہے۔ ہماری تاریخ میں سوائے جنگوں اور لوٹ مار اور کچھ نہیں ہے۔ کوئی ایسا کارنامہ نہیں کہ جس پر فخر کر سکیں‘ لہٰذا پوری تاریخ میں اگر فخر کے قابل کوئی نظر آتا ہے تو یہی فاتحین اور ان کی فتوحات۔ اسی کو ہم قابل فخر سمجھ کر ان کی

پوجا شروع کردیتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی فوجی جنرل اور فاتح ہمارے سیاسی نظام کو شکست دے کر برسر اقتدار آتا ہے تو اس میں ہم کبھی محمد بن قاسم کو دیکھتے ہیں تو کبھی محمود غزنوی کو؛اس طرح بار بار ہم شخصیتوں کے سحر میں گرفتار ہوتے ہیں اور بحیثیت قوم کے اپنی شخصیت کو کھو بیٹھتے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب تک تاریخ کو وسیع نقطہ نظر نہیں لکھا جائے گا اور اس میں معاشرے کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے کردار نہیں لایا جائے گا۔اس وقت تک تاریخ افراد کے حصار میں قید رہے گی۔اور یہ تاریخ لوگوں کے ذہن کو تنگنائے میں رکھ کر حکمرانوں کے مفاد کے لیے کام کرے گی۔تاریخ عظیم افراد کے کارناموں کا نام نہیں ہے'یہ لوگوں کی شمولیت سے بنتی اور آگے بڑھتی ہے۔

خاص طور سے ہمیں حملہ آوروں کے کردار کی وضاحت کرنی ضروری ہے کہ جو ہمیشہ عام لوگوں کے لیے تباہی و بربادی لاتے ہیں۔حملہ آور حملہ آور ہوتا ہے' چاہے وہ ہمارا ہو یا غیر کا۔تاریخ کو جذبات سے علیحدہ کر کے معروضی طور پر مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

